مولانا مفتی محمود

(حیات و خدمات)

نعیم آسی

مسلم اکادمی ○ وزیر پورہ ○ سیالکوٹ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول ———————— اکتوبر ۱۹۷۷ء

تعداد ———————— گیارہ سو

قیمت ———————— ۲۰/- روپے

جاوید ریاض پرنٹرز
لاہور

اِنتساب

والدِ مکرّم صاحبزادہ فضل حق مرحوم کے نام جن کے زیرِ سایہ
گزارے ہوئے لمحات میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں

و تحریک۔ ۳۶ء کا آئین۔ بیہ

۵۳ تا ۶۶

کا احیاء۔ علماء کا شاندار کارنامہ تحریکِ
آئین۔ ۵۸ء کا مارشل لاء۔ وفاق

۶۷ تا ۷۳

ب اتہام۔

۷۴ تا ۷۹

صر کی حمایت۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول ______

تعداد ______

قیمت ______

ترتیب

سرآغاز ۲۵ تا ۲۷

فرشتہ ۲۹ تا ۳۲

پہلا باب (رونمائی) ۳۳ تا ۴۴

رونمائی ۔ والدین ۔ تعلیم ۔ تدریس ۔ تبحرِ علمی ۔ اخلاق و عادات ۔ ذہانت و طباعی ۔ دیانتداری ۔ صبر و تحمل ۔ سادگی ۔ خوش مزاجی ۔ صلاحیتِ کار ۔ تحریر و انشاء ۔ قید و بند ۔ درونِ خانہ ۔

دوسرا باب (آزادی سے پہلے) ۴۵ تا ۵۲

تحریکِ پاکستان ۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک ۔ ۴۶ء کا الیکشن ۔ جمعیۃ کا فارمولا ۔

تیسرا باب (آزادی کے بعد) ۵۳ تا ۶۶

قراردادِ مقاصد ۔ جمعیۃ علماءِ اسلام کا احیاء ۔ علماء کا شاندار کارنامہ ۔ تحریکِ ختمِ نبوت ۔ جمعیۃ کی تنظیمِ نو ۔ ۵۶ء کا آئین ۔ ۵۸ء کا مارشل لاء ۔ وفاق المدارس الاسلامیہ ۔

چوتھا باب (اسمبلی کے ایوان میں) ۶۷ تا ۷۳

حزبِ اختلاف ۔ معرکۂ حق و باطل ۔ ایک اتہام ۔

پانچواں باب (مفتی محمود مصر میں) ۷۴ تا ۷۹

مجمع البحوث الاسلامیہ میں تقریر ۔ صدر ناصر کی حمایت ۔

چھٹا باب (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۹ء) ۸۰ تا ۹۰
۶۵ء کا صدارتی الیکشن ۔ جمعیۃ کا اُمیدوار "مفتی صاحب کی شکست"
متحدہ اِسلامی محاذ ۔ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا معرکہ ۔ جمعیۃ علماء کی تاریخ ساز
کانفرنس ۔ کامیابی کا آغاز ۔ بہیمانہ تشدد ۔ صدر ایوب کی شاطرانہ چال ۔
مفتی محمود کا جواب ۔
ساتواں باب (جمہوری مجلسِ عمل کا قیام) ۹۱ تا ۹۵
جمہوری مجلسِ عمل کا قیام ۔ جمعیۃ کی شرکت ۔
آٹھواں باب (گول میز کانفرنس)
گول میز کانفرنس ۔ جمعیۃ کا موقف ۔ بتکدۂ سیاست میں تکبیر کی صدا ۔
مارشل لا کی آمد ۔
نواں باب (پاکستان کے پہلے عام انتخابات) ۱۰۳ تا ۱۱۴
الیکشن کی ہماہمی ۔ جمعیۃ کا منشور ۔ جمعیۃ کا پہلا اِنتخابی جلسہ ۔ جمعیۃ کی اِنتخابی
حکمتِ عملی ۔ حیران کُن انتخابی نتائج ۔ مفتی محمودؒ فاتح بھٹو ۔
دسواں باب (آئینِ شریعت کانفرنس لاہور) ۱۱۵ تا ۱۱۹
مولانا عبداللہ درخواستی ۔ لیبیا کے سفیر جناب الغضنفی ۔ مولانا مفتی محمود ۔
گیارہواں باب (سقوطِ مشرقی پاکستان) ۱۲۰ تا ۱۵۳
بُحران کا آغاز ۔ مفتی صاحب کا موقف ۔ یحییٰ خاں کو دو ٹوک جواب ۔
مفتی محمود ڈھاکہ میں ۔ تہہ منظر ۔ التوائے اجلاس ۔ مشرقی پاکستان میں
شورِ قیامت ۔ مفتی صاحب کا تاریخی رول ۔ مشرقی پاکستان میں فوجی
کارروائی ۔ مفتی صاحب کی حُبّ الوطنی ۔ دورۂ مشرقِ وسطیٰ ۔ سیاست
کا جوار بھاٹا ۔ سہ جماعتی اتحاد ۔ مشرقی پاکستان میں سول حکومت ۔

ہندوستان کا مشرقی پاکستان پر حملہ ۔ علماء کا فتویٰ جہاد ۔ سقوطِ ڈھاکہ ۔

بارہواں باب (سقوط کے بعد) ۱۵۴ تا ۱۶۷

قائدِ عوام کا "نیا پاکستان" ۔ سہ فریقی معاہدہ ۔ کشمکش ۔ نیا معاہدہ ۔ عبوری آئین ۔

تیرہواں باب (حمود الرحمٰن کمیشن کے رُوبرُو) ۱۶۸ تا ۱۷۶

چودہواں باب (درویش وزیرِ اعلیٰ) ۱۷۷ تا ۱۹۳

امتناعِ شراب ۔ صوبائی زبان اُردو ۔ سرکاری لباس ۔ جہیز ایکٹ ۔ جوتے پر پابندی ۔ تعلیمی اصلاحات ۔ پردہ ۔ احترامِ رمضان آرڈی ننس ۔ سُود کی بندش ۔ تعطیلِ جمعہ کی سفارش ۔ اسلامی قوانین بورڈ ۔ سرسری جائزہ ۔ وزیری میں فقیری ۔ قصۂ محمود و ایاز ۔ ایک یاد ۔ ——— طیّارے کو حادثہ ۔ استعفاء ۔ حکومت کی پیشکش اور اس کا استرداد ۔

پندرہواں باب (آئینِ پاکستان کی تشکیل) ۱۹۴ تا ۱۹۹

پس منظر ۔ مفتی صاحب کی مساعی ۔

سولہواں باب (متحدہ جمہوری محاذ، خُونچکاں جِدّوجُہد) ۲۰۰ تا ۲۱۲

لیاقت باغ کا خونیں سانحہ ۔ ٹرین پر حملہ ۔ مری مذاکرات ۔ بنگلہ دیش نامنظور ۔ بلوچستان کا مسئلہ ۔ لاہور کنونشن ۔ سول نافرمانی ۔ مولانا شمس الدین کی شہادت ۔

سترہواں باب (قادیانی مسئلہ کا آئینی حل، مفتی صاحب کی خدمات) ۲۱۳ تا ۲۲۴

حزبِ اختلاف کی قرارداد ۔ اسمبلی کے اندر ۔ مرزا ناصر احمد پر جرح ۔ سب کمیٹی ۔ تاریخی فیصلہ ۔ مُبارک باد ۔

اٹھارہواں باب (پارلیمانی حزبِ اختلاف کی قیادت) ۲۲۵ تا ۲۳۲

نوماہی بائیکاٹ ۔ شرمناک کارروائی ۔ قاتلانہ حملہ ۔ ہنگامی پریس کانفرنس ۔ دوسری کوشش ۔

انیسواں باب (پاکستان قومی اتحاد، بے مثال جدّوجُہد) ۲۴۳ تا ۲۴۸

اتحاد کی تشکیل ۔ منشور ۔ تاریخی دھاندلی ۔ مولانا مفتی محمود کی کامیابی ۔ تاریخ ساز احتجاجی تحریک ۔ ہری پور جیل میں ۔ بے نتیجہ خط کتابت ۔ سہالہ میں ۔ عربوں کی سعیٔ مشکور ۔ مذاکرات، آغاز و انجام!

بیسواں باب (افکار و خیالات) ۲۴۹ تا ۲۷۱

یادگار انٹرویو ۔ اسلامی نظام ۔ طرزِ حکومت ۔ محدود جمہوریت ۔ یک جہتی ۔ خارجہ پالیسی ۔ اِسلامی ممالک کا اِتحاد ۔ اقتصادی پریشانی کا حل ۔ زرعی پالیسی ۔ معکوس ترقی کا حل ۔ بیوروکریسی ۔ تعلیم ۔ طلباء اور سیاسی جماعتیں ۔ نشری تقریر ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الحدیث

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ

عُلماء انبیاء کے جانشین ہیں۔

”عُلماء ہمیشہ اِسلام کے لیے ایک قوّتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں“

اِقبالؒ

”پُورے عرب میں آپ کی اسلام دوستی اور حُبّ الوطنی پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسلامی اصلاحات کے اجراء سے قرآنی حکومت کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ ہم آپ کو مُبارکباد پیش کرتے ہیں۔“

وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی بنام مولانا مفتی محمود

"مفتی محمود صاحب کی شخصیت اسلام کا ایک مُرقّع ہے مفتی صاحب
میرے سیاسی اور مذہبی اِمام ہیں ۔"

خان عبدالولی خان

"مفتی صاحب ایک عظیم محبِ وطن ہیں، مفتی صاحب کی وزارت
پر ذاتی منفعت کا کوئی داغ نہیں۔"

شورش کاشمیری مرحوم

> ”ہم اس محسنِ سرحد کے مشکور ہیں۔ جس نے سرحد کو اسلام
> کی تابانیت سے منور کر دیا ہے۔“
>
> مولانا شاہ احمد نورانی

”مارشل لاء کے خاتمہ اور جمہوری حقوق کی بحالی پر مفتی صاحب کو
مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“

میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ

”میں آیندہ کبھی مفتی محمود صاحب کے مقابلے میں الیکشن نہیں لڑونگا۔“

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیرِاعظم پاکستان

”مولانا مفتی محمود صاحب، علم و حکمت میں پچاس جیّد علماء سے
بڑھ کر ہیں۔“

علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ

”دیوبند کے ایک عالم نے اپنی حکومت سے یہ ثابت کر دیا
ہے کہ مملکت کے امور علماء دوسرے لوگوں سے احسن طریق پر
انجام دے سکتے ہیں۔“

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان

”مولانا مفتی محمود صاحب کی زیارت کے لیے میرا دِل بے چین
رہتا ہے۔“

پیرِ طریقت حضرت عبدالہادی دین پوری مدظلہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

سرِ آغاز

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے بارے میں بہت سی باتیں آپ سے کرنے کی تھیں۔ مگر وقت کی تنگ دامانی کے پیشِ نظر محض ان چند اہم امور کی وضاحت پر اکتفا کرتا ہوں:

۱۔ اس کتاب کا مرکزی کردار ایک مخلص اور سیدھا سادا انسان ہے۔ جس کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے اور جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس میں کوئی اینچ پیچ نہیں۔ وہ نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے۔ نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ نہ خود سپُردگی کا قائل ہے، نہ خواہ مخواہ لڑائی بھڑائی کا۔ یہ کتاب ایک باحمیت عالمِ دین، ایک زیرک سیاستدان اور ایک عالی دماغ مدبر و منتظم کی کہانی ہے۔ آپ اُن کے کسی خیال یا اقدام سے اختلاف کرسکتے ہیں۔ مگر یہ امرِ واقعہ ہے اور اس سے اِنکار ممکن نہیں کہ مفتی صاحب کی تمام تر سعی و جُہد اور تگ و تاز کا مرکزی نقطہ رُوزِ اوّل سے اسلام ـــــ اور صرف اسلام ہے۔ وہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے سوا اور کچھ نہیں

چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے بے حد محبوب ہیں۔

۲۔ جب اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں مرتب ہو رہا تھا، تب پی این اے آب و گِل کی منزل میں تھا۔ جب ابتدائی مسوّدہ مرتب ہوا تو مفتی صاحب سہالہ میں نظر بند تھے۔ اور مسٹر بھٹو اِقتدار کے ایوان میں فروکش۔ پھر حالات میں اس قدر تیزی سے تبدیلی آئی کہ مجھے بار بار مسوّدے پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ حتیٰ کہ کتابت شدہ اوراق میں حذف و اضافہ کرنا پڑا۔ جس سے کہیں کہیں عبارت کے تسلسل اور حُسن میں فرق آ گیا ہے۔ جس کے لیے میں اصحابِ ذوق سے معذرت خواہ ہوں۔

مفتی صاحب کی حیات و خدمات پر مشتمل یہ کتاب چونکہ نصف صدی کے سیاسی اُتار چڑھاؤ کی داستان ہے اس لیے اس میں کچھ موڑ ایسے بھی آ گئے ہیں جن سے ممکن ہے بعض لوگ اختلاف کریں۔ اُنہیں ایسا کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔ البتہ اختلاف اور مخالفت کا فرق ملحوظِ خاطر رہے۔

۳۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے۔ اُسے پوری چھان پھٹک اور تحقیق کے بعد لکھا ہے۔ میں نے جو بات جس جس ماخذ سے لی ہے۔ حاشیے میں اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ مفتی صاحب کی نجی زندگی پر جو کچھ ہے اس کا بیشتر انحصار اُن کی اپنی روایت پر ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے ماہنامہ "تبصرہ" کے "مفتی محمود نمبر" سے بہت مدد ملی۔ راقم ان تمام اصحاب کا شکرگزار ہے جن کی تحریروں سے اُس نے اس کتاب میں استفادہ کیا۔ میں برادرم بشیر کنور صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے کمال توجہ اور محنت سے اس کتاب کا سرِورق ڈیزائن کیا۔

میں نے "اقبال اور قادیانی" کی طرح اس کتاب کا پیش لفظ لکھوانے سے بھی گریز کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کتاب کے باقاعدہ آغاز سے پیشتر حضرت

مفتی صاحب کے ایک لائقِ احترام اُستاد جناب حاجی غلام حسین صاحب کھرل کا ایک مضمون بعنوان "فرشتہ" درج کر رہا ہوں۔ یہ عنوان اُن کا اپنا تجویز کردہ ہے۔ میں نے اسے آج سے سات آٹھ برس اُدھر پڑھا تھا۔ سادہ سی عبارت کے باوجود دِل میں کچھ ایسا گھر کر گیا کہ آج تک نہیں بھلا سکا ہوں۔

قارئین کو اس کتاب میں اگر کوئی چیز پسند آئے تو راقم اور اس کے والد کے لیے دُعا فرمائیں، اگر کہیں کوئی غلطی نظر پڑے تو آگاہ کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جا سکے۔

سیالکوٹ
۲۹ ستمبر ۱۹۷۷ء
جمعرات، بعد عصر

دُعاگو و دُعاجُو

حاجی غلام حسین کھرل

فرشتہ

میری زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ سابق صوبہ سرحد میں گزرا ہے۔ کیونکہ میں وہاں عرصہ ۴۰ سال تک شعبہ تعلیم سے منسلک رہا ہوں اب حالانکہ مجھے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تقریباً پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں تاہنوز سرحدی عوام کے حُسنِ سلوک اور تلامذہ کی یاد اور سعادت مندیوں کو تازہ پاتا ہوں۔

سال ۱۹۳۲ء میں جبکہ مڈل سکول پنیالہ میں تبادلہ کے لیے میرے نام احکامات جاری ہوتے۔ ان دنوں پنیالہ کی شہری سیاست پنیالہ سکول کے نظم و ضبط پر بُری طرح اثرانداز ہو رہی تھی اور سکول کا نظم و ضبط ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ایک کُہنہ مشق تجربہ کار مدرس کی ضرورت تھی۔ معلوم نہیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سکول پنیالہ (خان فضل خان) کو مجھ میں کیا خُوبی نظر آئی کہ انہوں نے اس اصلاحی اقدام کی ذمہ داری کا بوجھ مجھ ناتواں کے کندھوں پر ڈال دیا "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن"۔ مجھے طوعاً و کرہاً یہ ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔

اب اس ماحول میں نووارد ہونے کے باعث مجھے ایک ایسے نبّاض

کی ضرورت محسوس ہوئی جو رہبرِ صادق کا کام دے سکے اور حالات کے بگاڑ کے اصل اسباب و علل کی نشان دہی کرتے ہوئے ان شخصیات سے بھی آگاہ کرے جن کا نظم و ضبط کی شکست و ریخت میں پوشیدہ ہاتھ ہو۔ چنانچہ میں نے اکثر طلباء سے استفسار کیا لیکن ان سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ مجھے اپنے مشن کی ناکامی کا بڑا افسوس ہوا۔

اُن دنوں ایک طالب علم "محمود" نامی بھی زیرِ تعلیم تھا۔ جس کی کشادہ پیشانی سے حُسنِ سیرت کے آثار ہویدا تھے۔ اور اس کی بلند نگاہی سے عالی ہمتی اور اُولوالعزمی مترشح تھی۔ تعلیم سے دلچسپی بھی منفرد حیثیت کی حامل تھی۔ میں نے بطور تفحص اس سے بھی وہی پوچھا۔ جس کا اس سے پہلے ناکام اعادہ ہو چکا تھا۔

"محمود" نے کمال راست گوئی سے کام لیتے ہوئے تمام کوائف سے آگاہ کیا اور پیدا شدہ خرابیوں کے ازالہ و استیصال کے لیے ایسے مناسب اور برمحل مشورے دیئے کہ میں محمود کی ذہانت، اخلاقی جُرأت، بیباکی اور راست گفتاری کا قائل ہو گیا۔ اور داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب مجھے گوہرِ مقصود مل چکا تھا چنانچہ اللہ کا نام لے کر میں نے محمود کے تیار کردہ منصوبوں پر عمل شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں سکول کا نظم و ضبط ایک مثالی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور میرے تجربے و معاملہ فہمی کی دھاک بیٹھ گئی۔ احباب حیران تھے کہ میرے قیاس کتنے صحیح ہوتے ہیں اور کسی پیدا ہونے والی خرابی کا قبل از وقت انکشاف کیسے حاصل ہو جاتا ہے اور میں انہیں مسکراتے ہوئے جواب دیا کرتا تھا کہ مجھے میرا "فرشتہ" پہلے ہی سے آگاہ کر دیتا ہے۔ حالانکہ فرشتے سے میرا مقصود "محمود" ہوتا تھا۔ مئی ۱۹۳۴ء میں مجھے مڈل سکول کوٹ جائی میں تبدیل کیا گیا۔ اور "محمود" مڈل پاس ہو کر سکول کورس ختم کر چکا تو الوداع کے وقت میں نے محمود کے پدرِ بزرگوار خلیفہ محمد صدیق کو تاکید

کی کہ "اس گوہرِ گرانمایہ کا خیال رکھے، اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کرکے میاں "محمود" کی صلاحیتوں کو پنپنے کے مواقع فراہم کرے ؎

کوئی شبلی کوئی حالی نذیر احمد نکل آتے
تعجب کیا جو سرحد سے میاں محمود نکل آئے

اس کے بعد زمانہ گزرتا رہا۔ ہفتوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال بیت گئے۔ میں جانی مڈل سکول تحصیل ٹانک ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہیڈ ماسٹر تھا اور سال اگست ۱۹۵۲ء میں میں پشاور سے بذریعہ ریل واپس آ رہا تھا کہ عیسیٰ خیل ریلوے سٹیشن پر "محمود" مجھے "مفتی محمود" کے رُوپ میں ملا۔ جس کے چہرے پر عالمانہ جاہ و جلال شخصیت پر وقار علماء کرام کے ایک جمگھٹے میں متین چال چلتے ہوئے نظر آئے۔ باوجود ایک عرصہ دراز کے گزر جانے کے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اور تکلّفات سے بے نیاز رہتے ہوئے مجھے اپنا تعارف اس جملے سے کرایا: آپ کا دیرینہ غلام "فرشتہ" بفضلہٖ مفتی محمود آپ کے سامنے ہے۔ انتہائی صداقت سے چلتی ریل میں مجھے چادر کی مسند پر بٹھایا، اور لکی اسٹیشن تک ہمسفر رہے۔ جہاں وہ تقریر کرنے جا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ خدائے قدّوس نے عظمتِ کردار کے اس پیکر کو ملک و ملّت کی دینی خدمات کے لیے منتخب کرکے اہلِ پاکستان پر خاص احسان کیا ہے اور سیّدُ القومِ خادِمُہم کے شرف سے مشرف فرمایا ہے۔ گو اخبارات دینی رسائل اور معقول انسانوں کی روایات سے ان کی اسلامی خدمات کا تذکرہ عموماً سُنا جاتا ہے لیکن شرفِ زیارت کا موقع نہیں ملا۔ تاہم یہ مسلّم ہے کہ علامہ مفتی محمود صاحب مسلمانانِ پاکستان کی صحیح رہنمائی کا حق ادا کرنے میں بیش از بیش ہیں۔ میری دُعا ہے کہ خدائے قدیر ہر حال میں ان کا حامی و مددگار اور شاملِ حال ہو۔ آمین ثم آمین۔

مفتی محمود آ استاد کی سُن لے دُعا نورِ رحمت سے منور ہو کے تو چمکے سدا
دِل نشیں صورت تری خاطر نشاں سیرت تری اِک امانت دل میں ہے اُلفت تری عزت تری
فخرِ ملت زیبِ ملت بن کے تو چمکے سدا خادمِ اسلام و مسلم ہو ترا فیض عطا

(ماخوذ)

پہلا باب

رُونمائی

کِھلا ہوا رنگ ، باوقار چہرہ ، کُشادہ پیشانی جس پر تدبُر کے نقوش نمایاں، کچھ سوچتی اور بولتی ہوئی آنکھیں ، چمکتی ڈاڑھی ، پیٹے دار بال، جو کبھی سیاہ ہوا کرتے تھے اب سفیدی عمرِ رفتہ کو آواز دیتی معلوم ہوتی ہے ۔ سَر پر ریشمی رُومال ، قد میانہ ، بدن دوہرا ، اُوپر کھدر کا ڈھیلا ڈھالا لباس، بول چال سادہ ، عجز و انکسار میں ڈھلا ہوا انسان ، یہ ہیں مولانا مفتی محمود ۔ ۶ر ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے ۔

والدین

والد کا نام خلیفہ محمد صدیق ، قوم افغان ، قبیلہ ناصر ، شاخ یحییٰ خیل ، خاندان عَلَم ۔ والدِ بزرگوار افغانستان سے ترکِ وطن کرکے ڈیرہ آئے اور ڈیرہ ہی کے ہو کے رہ گئے ۔ شریعت کے ماہر اور طریقت کے شہسوار تھے ۔ طریقت کے

سلاسلِ اربعہ میں خلیفۂ مُجاز اور ذکر و تلقین میں طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ پر کاربند تھے۔ مفتی صاحب بھی اسی پر عامل ہیں اسی کا اثر کہہ لیجیے یا اتفاق کی بات کہ اللہ تعالیٰ ان سے کام بھی وہی لے رہا ہے جس کا آغاز اکبری دور میں حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔ والدہ ماجدہ ایک نیک خاتون تھیں۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

تعلیم

ابتدائی تعلیم "گورنمنٹ اسکول پنیالہ" میں حاصل کی۔ ساتھ ساتھ گھر پر دینی کُتب پڑھتے رہے۔ جب سکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو اُستاد نے مفتی صاحب کے والد کو تاکید کی: "اس گوہرِ گراں مایہ کا خیال رکھیں اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر کے میاں محمود کی صلاحیتوں کو پنپنے کے مواقع فراہم کریں ؎

کوئی شبلی، کوئی حالی نذیر احمد نِکل آئے
تعجب کیا جو سرحد سے میاں محمود نِکل آئے"[1]

مگر خاندانی و ذہنی رجحانات کے باعث میٹرک کے بعد تمام تر توجہ عربی علُوم کی تحصیل کی طرف مُنعطف ہوئی۔ صَرف و نحو کی جُملہ کتابیں اور منطق میں "سلم العلوم" تک تعلیم گھر پر ہوئی مزید تحصیلِ عِلم کے لیے مراد آباد، دیوبند اور دہلی کا سفر اختیار کیا۔ حدیث "مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد" (مراد آباد) میں حضرت مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی جو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (اسیرِ مالٹا) کے نامور شاگرد اور حدیث کے بُلند پایہ اُستاد تھے۔ ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں دارالعلوم دیوبند

---

[1] ماہنامہ "تبصرہ" لاہور کا "مفتی محمود نمبر" بابت ماہ جنوری ۱۹۷۰ء ص ۴۲

سے سندِ فراغت حاصل کی ۔

تدریس

تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب وطن واپس آئے اور اپنے گاؤں میں چار سال تک تدریس کی پھر عیسیٰ خیل (ضلع میانوالی) میں تین سال تک مدرّس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔ ۱۹۵۰ء میں "مدرسہ قاسم العلوم" مُلتان میں مدرس ہو کر گئے ۔ جہاں رفتہ رفتہ صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے ۔ منصبِ افتاء بھی آپ کے سپرد ہے ۔ اب تک کوئی بائیس ہزار شرعی فتوے آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں جن کا مکمل ریکارڈ موجود ہے[1] اگر یہ چھپ جائیں تو دینِ حقّہ کی ایک بڑی خدمت ہو ۔ "قاسم العلوم" آج مُلتان کے دو بڑے مدارس میں سے ایک ہے ۔ یاد رہے اس مدرسہ کی بنیاد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے رکھی ۔ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نامِ نامی سے اِسے منسوب کیا گیا ۔

تبحرِ علمی

مولانا مفتی محمود اِسلام کے متبحر عالم، حدیث کے ماہر اور فقہ کے شناور کی حیثیت سے اپنا جواب آپ ہیں ۔ افتاء میں بڑے بڑے عُلماء آپ پر اعتماد کرتے ہیں ۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت قاری محمد طیب صاحب نے "تاریخ دارالعلوم دیوبند"

---

[1] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک ص ۵۰ - ۵۱ ستمبر ۱۹۷۶ء

میں مفتی صاحب کا نہایت وقیع لفظوں میں تذکرہ لکھا ہے۔ علامہ شمس الحق افغانی فرماتے ہیں "مولانا مفتی محمود صاحب، علم و حکمت میں پچاس جید علماء سے بڑھ کر ہیں[1]"۔ مولانا محمد یوسف بنوری لکھتے ہیں۔ "مفتی محمود صاحب عصرِ حاضر کے قابل فقیہ، اسلامی قانون کی تدوین میں عالمِ اسلام میں ممتاز اور ایک سلیم الذوق محدّث ہیں[2]"، سیاسیات، عمرانیات اور معاشیات پر گہری نظر اور فلسفہ و منطق میں کمال درجہ عبور حاصل ہے۔ سائنس سے بھی آشنائی ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور پشتو میں یکساں مہارت ہے۔ انگریزی میں درخور وافی ہے۔ عربی اس طرح بول لیتے ہیں جیسے ہم آپ پنجابی اور اُردو بولتے ہیں۔ قرآن اس ادا سے پڑھتے ہیں کہ پنجاب میں حجاز یاد آجاتے۔ فنِ تجوید میں مہارتِ تامہ رکھتے اور دس قرأتوں کے قاری ہیں۔ اپنے علم و فضل کے باعث عرب ممالک میں نہایت قدر و عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اخلاق و عادات

ذاتی اوصاف و خصائص کے اعتبار سے مفتی صاحب ایک بلند پایہ انسان ہیں۔ اگر مختصراً کہوں تو اتنا کافی ہے کہ "کردار کی انگوٹھی میں اخلاق کا نگینہ ہیں"...... ہر لحظہ مسکرانے کی عادت، مزاج میں نرمی، طبیعت میں انکسار۔ بے حد ٹھہرا ہوا انسان۔ استقامت، عزیمت، علم، حلم، وقار، تدبر، فراست، ذہانت اور اخلاق کو گوندھ کر اگر کوئی انسانی وجود

---

[1] "مفتی محمود کی سیاست" ص ۱۸۴ از قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ

[2] ماہنامہ "بینات" کراچی جولائی ۱۹۷۷ء ص ۴

تیار کیا جائے تو وہ مفتی محمود ہوں گے ۔ گھریلو اور ذاتی زندگی حد درجہ سادہ ۔ ماسوا پابندیٔ شریعت آپ کہیں بھی کوئی امتیاز یا تفوق اُن میں نہیں دیکھیں گے ۔ نہ کوئی عالمانہ کبر و تبختر ہے ، نہ بلند و بالا رہنے کا کوئی ادنیٰ سا داعیہ رہنے سہنے میں ۔ کھانے پینے میں ، اُٹھنے بیٹھنے میں ، بولنے چالنے میں الغرض روزمرہ زندگی کے کسی بھی طور طریقے میں آپ اُنہیں عام انسانوں سے ذرہ بھر مختلف اور بالا نہیں پائیں گے ۔ اُن سے ایک عالم و فاضل اور امیر سے لے کر ایک جاہل و عامی اور فقیر تک سب یکساں رسائی حاصل کر سکتے ہیں ۔ وہ ہر شخص سے اُس کی استعداد کے مطابق گفتگو کرتے اور ہر شخص کی بات نہایت توجہ سے سُنتے ہیں ۔

ذہانت و طباعی

ذہانت و ذکاوت خُدا داد چیزیں ہیں اور ان کا اندازہ بچپن ہی میں ہونے لگتا ہے ۔ ہیرا تراشا ہوا نہ بھی ہو تب بھی اپنی حقیقت کہہ سُناتا ہے ۔ مفتی صاحب کی غیر معمولی ذہانت و طباعی اور عالی ہمتی و اولوالعزمی کے آثار بچپن ہی میں نمایاں تھے ۔ اُن کے ایک اُستاد لکھتے ہیں ۔ "محمود کی کشادہ پیشانی سے حُسنِ سیرت کے آثار ہویدا تھے اور اُس کی بلند نگاہی سے عالی ہمتی اور اولوالعزمی مترشح تھی ۔" یہ ایک حیران کُن واقعہ ہے اور اس سے اُن کی خُداداد اِنتظامی صلاحیتوں (ADMINISTRATION SENSE) کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پنیالہ اسکول کا برباد شدہ نظم و ضبط جسے بزرگ اساتذہ بحال کرنے میں ناکام رہے تھے نوعمر (مفتی) محمود کے ناخنِ تدبیر نے درست اور چاروں خانے چوکس کر دیا ۔ مفتی صاحب نے اگرچہ سیاسیات یا قانون میں کسی یونیورسٹی یا لاء کالج سے ڈگری حاصل نہیں

کی، وہ روایتی طور پر کسی دارالفنون کے متعلم بھی نہیں رہے مگر یہ اُن کی مومنانہ فراست غیر معمولی ذہانت، نظر کے عُمق اور مطالعے کی وُسعت کا نتیجہ ہے کہ جب وہ ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں تو قانون و سیاسیات اُن کے خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں۔

دیانتداری

مفتی صاحب کی خُوبیوں کا اگر ست نکالا جائے تو وہ یہ پانچ چھ چیزیں ہوں گی۔ ایمان و یقین، فہم و فراست، صبر و تحمل، عزیمت و استقامت اور امانت و دیانت ـــــ دیانت کا اندازہ اس ایک معمولی سے واقعے سے کیجیے کہ جب مفتی صاحب صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے تو بنوں میں جمعیۃ کے ایک کارکن شریعت خاں سائل جو پشتو زبان کے شاعر بھی ہیں اور جنہوں نے ۷۰ء کے الیکشن میں جمعیۃ کے لیے خاصا کام کیا۔ وہ مفتی صاحب کے پاس پہنچ کر مجھے اپنے ہاتھوں سے ایک تعریفی سند لکھ دیجیے۔ مفتی صاحب نے فرمایا "مجھے اس کا اختیار نہیں" وہ کارکن اس پر اتنا بگڑا کہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے "النبی الخاتم" میں ایک جگہ لکھا ہے "بی بی کی عصمت کا پتہ بیچارگی میں نہیں چلتا، چارہ ہو اور عصمت ہو، عصمت اسی کا نام ہے" مولانا مفتی محمود نے چارہ ہوتے ہوتے عصمت کو قائم رکھا۔ لاریب یہ بڑی ہمت کا کام تھا۔ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم نے باوجود شدید اختلاف رکھنے کے مفتی صاحب کی وزارتِ عُلیا سے احتجاجاً علیحدگی پر لکھا تھا کہ "مفتی صاحب کی وزارت پر مالی منفعت کا کوئی داغ نہیں" ویسے بھی جس نے اُصول کی خاطر وزارتِ عُلیا کی کُرسی کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہو بھلا اُس کے دِل

میں چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے کیا کشش ہو سکتی تھی؟

صبر و تحمّل

مولانا مفتی محمود کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی میں تحمّل، متانت، صبر و ضبط اور صُلح کوشی کی صفات بہت نمایاں ہیں۔ مُفتی صاحب کے ایک مزاج دان نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ”وہ ایک معتدل قسم کے آدمی ہیں۔ مذہب و سیاست میں یہی اعتدال اُن کی شخصیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ انہوں نے کسی مسئلہ پر سطحی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ اسلام اور اسلامی اصولوں پر وہ سراپا جذبات ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایمان کی علامت ہے[1]۔“ ایک اخبار نویس نے پیشگوئی کی تھی ”معاملہ فہمی، تدبر اور صُلح کوشی کی صفات نے مفتی صاحب کے سیاسی مستقبل کا دائرہ وسیع کر دیا ہے[2]۔“ وقت نے اس پیشگوئی کی حرف بحرف تصدیق کر دی ہے۔

مفتی صاحب کے متذکرہ اوصاف کا اندازہ ہر شخص تھوڑی سی دیر اُن کے پاس بیٹھ کر بخوبی کر سکتا ہے۔

سادگی

سادگی مفتی صاحب کا طبعی جوہر و زیور ہے۔ خوراک، لباس، رفتار، گفتار، نشست، برخاست، عادات، اطوار ہر معاملہ میں بے انتہا سادہ۔ استغنا۔

---

[1] ”مفتی محمود کی سیاست“ ص ۱۸۰ از قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ

[2] ایضاً ص ۱۸۲

ربِ کریم نے معلوم ہوتا ہے۔ کُوٹ کُوٹ کر طبیعت میں بھر دیا ہے۔ حد درجہ اکل کھرا انسان، تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دُور۔ اس شعر کی چلتی پھرتی تصویر۔

تصنع سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گُل میں گُل بوٹا کہاں ہے

نہ مِلے کے جَتی تو سبھی ہیں۔ ہاتھ لگنے پر قابو میں رہنے والے خال خال۔ مفتی صاحب کا شمار ایسے ہی خال خال لوگوں میں ہے۔ آپ جب صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلےٰ بنے۔ تو انتظامیہ نے اُن کی رہائش کے لیے چار ہزار روپے ماہوار کی ایک کوٹھی کرایہ پر لی۔ جس کا ہزار روپیہ مہینہ تنہا صفائی کا خرچ تھا۔ مفتی صاحب نے یہ کہہ کر اُس کوٹھی میں رہنے سے انکار کر دیا کہ ”ایک غریب صوبے کے وزیرِ اعلیٰ کو یہ زیب نہیں دیتا۔“ وزیرِ اعلیٰ بننے پر بھی اُن پر درویشی غالب رہی۔ اور اُن کی زندگی میں سرِ مُو کوئی فرق نہ آیا۔

خُوش مزاجی

مفتی صاحب اپنی باغ و بہار طبیعت کے باعث جس محفل میں ہوں رونقِ محفل ہوتے ہیں۔ زُہد ہے، مگر خُشک نہیں۔ چٹکیاں لینا اور پُھلجھڑیوں پہ داد دینا یہی اُن کا مزاج ہے۔ حد سے باہر قدم نہیں دھرتے۔ قدرت نے حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کا ملکہ بھی خوب عطا کیا ہے۔ بات مختصر مگر وزن دار کرتے ہیں۔ ”اللہ کے بندے“ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ جو ایک دفعہ ان کے پاس بیٹھ جائے اُنہی کا ہو جاتا ہے۔ لوگ شکار کرنے کو آتے مگر شکار ہو کر جاتے ہیں۔ بات اگرچہ سیاسی ہے مگر ہے مزیدار۔ ایک دفعہ بھٹو صاحب نے مفتی صاحب اور ولی خان صاحب سے دوستی کا پیمان باندھا، مگر سیاست آڑے آگئی اور چُھپکے چُھپکے

خان عبدالقیوم خاں سے بھی یارانہ گانٹھ لیا۔ اخبار نویسوں کو خُدا ایسی خبر دے۔ ایک اخبار نویس نے عبدالولی خان سے پوچھا "آپ کی کیا رائے ہے؟" ولی خاں مسکرا کر کہنے لگے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" کسی نے لقمہ دیا "یہ نیا نکاح ہے۔" ولی خاں نے گرہ لگائی "پھر تو مفتی صاحب ہی بہتر فتویٰ دے سکتے ہیں۔" مفتی صاحب کھلی نشست پر فردکش تھے۔ فوراً جواب دیا "جناب یہ سیاسی نکاح ہے۔ آپ مُجھ سے بہتر رائے دے سکتے ہیں۔" سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اسی طرح اور کئی لطائف ہیں مگر سب سُنانے کا موقع نہیں۔

صلاحیتِ کار

مبدآ فیاض نے مفتی صاحب کو محنت اور تنظیمی صلاحیتوں سے بھی حِصّۂ وافر عطا کیا ہے۔ مدرسہ کی چٹائی ہو یا اسمبلی کا ایوان، جمعیۃ کے نظم و ترتیب کا مسئلہ ہو یا متحدہ حزبِ اختلاف کی قیادت، وزارتِ عُلیا کا منصب ہو یا سیاسی مذاکرات کی میز سب مفتی صاحب کی خداداد صلاحیتوں کے شاہد اور امین ہیں۔ انتھک محنت کے ساتھ دوستوں کا اعتماد حاصل کرنے میں اُنہیں بڑا کمال حاصل ہے۔ جو کچھ کرتے انتہائی خلوصِ نیت سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس کام کا بیڑا اُٹھاتے ہیں کامرانی اُن کے قدم چُومتی ہے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی کی علیحدگی نے جمعیۃ کے اندر ایک زبردست بُحران پیدا کر دیا تھا۔ عین ممکن تھا جمعیۃ ختم ہو جاتی مگر مفتی صاحب کی متحرک شخصیت نے نہایت تدبر اور حوصلہ مندی کے ساتھ اس صُورتِ حال کا سامنا کیا۔ مفتی صاحب کی تنظیمی صلاحیتوں کی یہ سب سے بڑی آزمائش تھی جس میں خُداوند قدوس نے مفتی صاحب کو کامیاب کیا۔ سابق وزیرِ اعظم مسٹر بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے دوران مفتی صاحب نے جس بُردباری اور حوصلے کا ثبوت

دیا اور جس طرح اب پاکستان قومی اتحاد کی نیا کھے رہے ہیں وہ کچھ انہی کا کام ہے ۔

تحریر و انشاء

مفتی صاحب نے کہا بہت اور لکھا کم ہے ۔ ہفت روزہ " خدّام الدین لاہور کے رئیس التحریر اور " ترجمانِ اسلام " لاہور کے سرپرست ہیں ۔ " خدّام الدین " کے جو اداریئے آپ کے قلم سے نکلتے ہیں پڑھنے کی چیز ہوتے ہیں ۔ مولانا سمیع الحق لکھتے ہیں کہ " حضرت مفتی صاحب عربی شعر و شاعری کا بھی بڑا عجب ذوق رکھتے ہیں ۔ عربی قصائد ان کے " الصدیق " ملتان میں بھی چھپتے رہے اور میں نے مفتی صاحب سے سُنا کہ بہت بڑی تعداد ایسے قصائد کی ہے جو غیر مطبوعہ ہیں ۔ (ہری پور) جیل میں اُردو فارسی شعر و شاعری (اور) ادب اور لسانیات کی نکتہ آفرینیوں کا بھی عمدہ مظاہرہ ہوا[1] ۔ " آج کل عربی زبان میں مشہور محدث امام ابو عیسیٰ ترمذی کی " جامع " کی شرح لکھ رہے ہیں ۔ " ہری پور جیل " میں اس کی تحریر کا آغاز ہوا ۔ اگر مکمّل ہو گئی تو خُوب چیز ہو گی ۔

قید و بند

سیاست اور جیل لازم و ملزوم ہیں ۔ سیاست کی وادی کے ہر مسافر کو اس راہ سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے ۔ مفتی صاحب نے جب سے راہِ شوق میں قدم رکھا ہے کئی دفعہ جیل ہو آئے ہیں ۔ پہلی دفعہ تحریکِ ختمِ نبوت ۵۳ء میں ایک سال کے لیے

---

[1] مولانا سمیع الحق کا مکتوب مصنف کے نام ۵ شوال ۹۷ھ

جیل گئے۔ تب آپ کو ملتان جیل میں رکھا گیا۔ دو دفعہ اس کے بعد حاضریِ بھری۔ چوتھی دفعہ مسٹر بھٹو کے خلاف تحریک چلاتے ہوئے پشاور میں گرفتار ہوئے۔ جہاں بیگم صاحبہ خان عبدالولی خاں بھی آپ کے ہمراہ گرفتار ہوئیں لیکن اسی روز رہائی ہوگئی۔ چند روز بعد پھر پشاور میں گرفتاری اور رہائی عمل میں آئی۔ چھٹی گرفتاری ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت لاہور سے ہوئی اور تین ماہ کے لیے راولپنڈی جیل میں مقید کر دیا گیا۔ جہاں سے پہلے ہری پور جیل اور پھر سہالہ میں لے جایا گیا۔ جب سابق وزیرِ اعظم مسٹر بھٹو پر ہر طرف سے دباؤ پڑا تو انہوں نے مذاکرات کے لیے رہا کر دیا ۴؍ اور ۵؍ جولائی ۷۷ء کی درمیانی رات فوج نے مسٹر بھٹو کی حکومت ختم کر دی اور مفتی صاحب سمیت پاکستان قومی اتحاد کے تقریباً تمام مرکزی لیڈروں کو اپنی "عارضی حفاظت" میں لے لیا۔ تادمِ تحریر یہ مفتی صاحب کی آخری گرفتاری ہے ؎

شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست　　ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

درونِ خانہ

شادی کب ہوئی معلوم نہ ہو سکا۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ایک لڑکا پیدا ہونے کے کچھ دیر بعد اِنتقال کر گیا۔ بڑا لڑکا مولوی فضل الرحمٰن، مولانا عبدالحق حقانی کے زیرِ سایہ "دارالعلوم حقانیہ" میں پڑھتا ہے۔ وہی مولانا عبدالحق جنہوں نے مارچ ۷۷ء کے انتخابات میں صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر نصراللہ خاں خٹک کو شکست فاش دی۔ مفتی صاحب کی دِلی آرزو ہے کہ خُدا تعالیٰ اُن کے بچوں کو دینِ مُصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی توفیق دے اور اُن سے وہ کام لے جن سے وہ راضی ہو۔

والدِ ماجد کی وفات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ گھر کے تمام امور کی نگرانی مفتی

صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا محمد عمر ڈیروی کے سپرد ہے۔ آبائی پیشہ زمینداری اور مکان اس دور میں بھی کچا ہے۔

دوسرا باب

آزادی سے پہلے

سیاست کی وادی دلچسپ بھی ہے اور خارزار بھی اس میں آج کا دوست کل کو دشمن بن جاتا ہے اور دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ان جھگڑوں کی ماہیت سمجھنے سے گریز کرتیں اور ترکہ میں ملنے والے اختلافات کو اپنے دامن سے ہوائیں دے دے کر پالتی ہیں۔ نتیجۃً نقصان اُٹھاتی ہیں۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں ہندوستان کی سیاسیات پر مُلک گیر جماعت کی حیثیت سے کانگریس ہی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ احرار پنجاب کی حد تک بے پناہ سیاسی طاقت تھے۔ مگر پنجاب سے باہر وہ بات نہ تھی۔ جمعیۃ العلماء ایک مذہبی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں میں خاصا رسوخ رکھتی تھی اور یوپی میں نہایت قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ مسلم لیگ کا معاملہ کچھ اس طرح تھا ؎

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

قائداعظم چوتھے دہے کے آغاز ہی میں مایوس ہو کر انگلستان جا چکے تھے۔ سمجھدار

مسلمان رہنما اس صورتِ حال سے خاصے پریشان تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا سوال تھا۔ ادھر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ۱۹۳۷ء میں الیکشن کا پیچ آپڑا۔ ـــــــــ اس دوران قائداعظمؒ لندن سے واپس بلائے گئے۔ تمام صُورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے یُوپی میں جمعیۃ العلماء اور پنجاب میں احرار سے انتخابی سمجھوتہ کیا۔ علامہ اقبالؒ کی بھی یہی خواہش تھی۔ سُوئے اتفاق احرار کے ساتھ لیگ کی نہ نبھ سکی اور برکت علی محمڈن ہال کے واقعہ کے بعد احرار لیگ سے علیحدہ ہو گئے[1] البتہ یوپی کے تمام اضلاع میں مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء نے باہمی اشتراک سے الیکشن لڑا۔

مفتی محمود۔ اُن دنوں "مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد" مراد آباد میں شیخ الحدیث، مولانا فخرالدینؒ سے حدیث پڑھتے تھے، انہوں نے الیکشن کے زمانہ میں اپنے اکابر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کی زیرِ نگرانی سارے یُوپی میں کام کیا۔ انہی دنوں مفتی صاحب کی جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ وابستگی ہوئی۔[2]

جمعیۃ علماء ہند، ہندوستان میں علماء کی سب سے زیادہ بااثر تنظیم تھی۔ اس کو علماء حق کے اُس سلسلہ کی کڑی کہا جاسکتا ہے۔ جس کا آغاز حضرت مجدد الفِ ثانی سرہندیؒ کی مساعی سے ہوا۔ اس کے پیش رووں میں حُجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، محدث العصر حضرت رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اسیرِ مالٹا ایسے بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ جنہوں نے دار درس

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے "اکابرِ احرار اور بانی پاکستان" مصنفہ ماسٹر تاج الدین انصاری مرحوم

[2] ماہنامہ "تبصرہ" (لاہور) کا "مفتی محمود نمبر" جنوری ۱۹۷۰ء ص ۱۶

میں جھول کر انگریزی استعمار کا سر توڑا۔ ان علماء پر خاندانِ ولی اللّٰہی کا اثر تھا۔ وہی ولی اللّٰہی خاندان جس نے ہندوستان میں آزادی کی جوت جگائی۔ شاہ عبدالعزیزؒ (فرزندِ اکبر حضرت شاہ ولی اللہؒ) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان کے "دارالحرب" ہونے کا فتویٰ جاری کیا۔ جمعیۃ عُلما کی اِس تاریخ نے اُس کا ایک مزاج اور ذہن بنا دیا تھا۔ جسے ہم انگریزوں کے خلاف جارحانہ ذہن (OFFENSIVE MIND) کا نام دے سکتے ہیں۔

مسلم لیگ کا اپنا ذہن تھا۔ اُس میں انگریز دُشمنی کے وہ جراثیم نہ تھے جو جمعیۃ العلماء یا احرار میں پائے جاتے تھے جمعیۃ العلماء اور احرار کے اکابر قائدِ اعظمؒ کی حد تک تو اعتماد کرتے مگر اُن کے بعد "شکوک و شبہات" کا ایک ایسا جنگل اُگ آتا جس کا سامنا ان لوگوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ چنانچہ انتخابات ختم ہونے پر مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا جو پہلا اجلاس ہوا اُسی میں رجعت پسندوں کے مسئلہ پر جمعیۃ اور لیگ کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے اور پھر بتدریج یہ اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے بالآخر دونوں جماعتوں کی راہیں ایک دُوسرے سے جُدا ہو گئیں۔ اور پھر یہ لوگ کبھی باہم مِل کر نہ چل سکے۔

تحریکِ پاکستان

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان "دُکھی دلوں کی فریاد و فغاں" تھی۔ جب مسلم لیگ نے ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو "قراردادِ لاہور" جو بعد میں "قراردادِ پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی، منظور کی تو مسلم لیگ کی عوامی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ مسلمان رائے عامہ کو اپنے تمام دکھوں کا مداوا پاکستان ہی میں نظر آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مطالبہ عامۃ المسلمین کے دلوں کی دھڑکن بن گیا

وہ مسلمان جو احرار یا جمعیۃ علماء کے ساتھ وابستہ تھے وہ ایک بہت بڑی آزمائش سے دوچار ہو گئے۔ اس حقیقت سے وہ بے خبر نہ تھے کہ مطالبۂ پاکستان کا اصل محرک ہندوؤں کا ناروا طرزِ عمل ہے۔ جو پیپل کے درخت کو تو دیوتا مانتا مگر مسلمان کے سائے سے بھی بدکتا ہے لیکن دوسری طرف مشکل یہ تھی کہ مسلم لیگ میں جو لوگ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ چل رہے تھے اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں جمعیۃ یا احرار والے اُن پر اعتماد کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ اور یہ بات بھی تھی کہ وہ فوری تقسیم کو ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا واحد حل بھی نہ سمجھتے تھے۔

۱۹۴۲ء تک جمعیۃ علماء ہند میں ایک ہی رائے ہوتی تھی۔ بعد میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ پاکستان کے مسئلہ پر اختلاف کے باعث دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے۔ اور پھر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ کی مناسبت سے جمعیۃ علماءِ اسلام کی بنا ڈالی[۱]۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے لیے قانونِ اسلام پر عمل کرنے کے لیے ایک جُدا وطن چاہتے تھے جس کا مطالبہ مسلم لیگ لے کر اُٹھی تھی۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ اگر اُن کا پاکستان بننے سے پہلے انتقال ہو جائے تو اُنہیں اُس جگہ دفن کیا جائے جہاں پاکستان بننا یقینی ہو[۲] انہوں نے اور اُن کے سب عظیم ساتھیوں مثل مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ وغیرہ نے حصولِ پاکستان کے لیے انتھک جدوجہد کی۔ جب جمعیۃ میں یہ اختلافِ رائے پیدا ہوا تو مولانا مفتی محمود نے

---

[۱] "اردو دائرۃ المعارف" ج ۷ ص ۲۰۴

[۲] "شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا" ج ۱۴ ص ۶۵۷

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کے تمام تر احترام کے باوجود حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ کے سیاسی مسلک کا اتباع کیا اور اُن کے زیرِ نگرانی خدمات انجام دیں ۔

ہندوستان چھوڑ دو تحریک

دوسری عالمگیر جنگ میں جب جاپانی فوجیں برما کو عبور کر کے اِدھر کلکتہ اور اُدھر مدراس پر دستک دے رہی تھیں اور ہر شخص کو یہ یقین ہو رہا تھا کہ اب ہندوستان سے برطانیہ کا جنازہ اُٹھنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی ۔ ایسے میں گاندھی جی نے جو بقول چودھری افضل حق مرحوم فطری طور پر آندھی تھے "ہندوستان چھوڑ دو" کی طوفانی تحریک کا آغاز کر دیا ۔ یہ ۴۲ء کا قصہ ہے ۔ عوامی سطح پر یہ آخری متحدہ سیاسی تحریک تھی ۔ جس میں ۴۵ ہزار ہندو مسلمان قید ہوئے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ؒ بھی اسی دور میں قلعہ احمد نگر میں بند کیے گئے ۔ جہاں اُردو ادب کا شاہکار "غبارِ خاطر" وجود میں آیا ۔ مولانا مفتی محمود نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا ۔ اس وقت مفتی صاحب اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے اور جمعیۃ علماء ہند کی آل انڈیا کونسل کے رُکن اور سرحد جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے ۔ مفتی صاحب نے محض تیئیس سال کی عمر میں یہ اعزاز حاصل کیا ۔[1]

۴۶ء کا الیکشن

مئی ۴۵ء میں یورپ میں جنگ ختم ہو گئی اگست میں جاپان نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ۔ اب ہندوستان کی آزادی ناگزیر ہو چکی تھی ۔ اُدھر جولائی ۴۵ء کے

---

[1] ماہنامہ "تبصرہ" (لاہور) کا "مفتی محمود نمبر" جنوری ۱۹۷۰ء ص ۱۶

برطانوی انتخابات میں لیبر پارٹی نے پلڑا مار لیا تھا۔ نئی حکمران جماعت ہندوستان کے بارے میں زیادہ صاف ذہن کی مالک تھی۔ اقتدار سنبھالتے ہی اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۴۶ء کے شروع میں ہندوستان میں عام انتخابات کروائے جائیں[1]۔ وہ اس طرح ہندوستانی سیاست میں مختلف جماعتوں کے رسُوخ کا اندازہ کر کے اس قضیے کو حل کر دینا چاہتی تھی۔ مسلم لیگ نے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد پر یہ الیکشن لڑا اور بے مثال کامیابی حاصل کی۔ وہ تمام مسلمان جماعتیں جو مسلم لیگ کے مقابلہ پر آئیں، اُنہیں بُری طرح ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

جمعیۃ کا فارمولا

پیچھے گزر چکا ہے کہ پاکستان کے مسئلہ پر جمعیۃ علماء ہند میں دو رائے پیدا ہوئیں۔ ایک رائے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تھی۔ وہ پاکستان کے حامی تھے۔ دوسری رائے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تھی۔ اُن کا اُس وقت یہ نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے نقلِ آبادی اور فوری جُدا وطن مناسب نہیں۔ اُنہوں نے اپنے تئیں برِصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کے بہترین مفاد میں یہ فارمولا پیش کیا:

۱۔ صُوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صُوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صُوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صُوبوں کے حوالے

---

[1] "محمد علی جناح" ص ۲۴۶ از ہیکٹر بولائتھو

ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو، ہندو ۴۵۔ مسلمان ۴۵۔ دوسری اقلیتیں ۱۰۔

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کردے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہوں گے۔"

جمعیۃ نے اپنے اس فارمولے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"اس فارمولے کے یہ فائدے ہوں گے:

(ا) اہم پورٹ فولیو (قلمدانِ وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوگی۔

(ب) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جائے تو صوبہ کشمیر، پورا صوبہ پنجاب، کیمبلپور سے سہارنپور کی سرحد تک۔ پورا صوبہ بنگال، مسلم اکثریت کے زیرِ اقتدار ہوں گے۔ ہر طرح ہندوستان کے کل چودہ صوبوں میں سے پانچ صوبے ایسے ہوں گے جہاں مسلم اکثریت کا اقتدار ہوگا۔ اور کشمیر سمیت پندرہ میں سے چھ صوبے ایسے ہوں گے۔

(ج) صوبہ دہلی اور صوبہ آسام میں مسلمان ۳۴ فیصد ہیں۔ حکومت میں مسلمانوں کا حصہ مساوی کے قریب ہوگا۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ ۳۰ یا ۳۴ فیصد ہوگا۔ وزارتوں میں مؤثر شمولیت ہوگی۔

(د) مذہبی اور فرقہ وارانہ امور میں مسلمانوں کو حقِ استرداد حاصل ہوگا"[1]

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ (دہلی) کا "مجاہدِ ملت نمبر" ص ۵۸ بحوالہ "شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا" ج ۱۴ ص ۶۵۷

جمعیۃ علماء ہند نے ۴۶ء کا الیکشن اسی فارمولے کی بنیاد پر لڑا۔ مولانا مفتی محمود نے اپنے اکابر کے ساتھ اس الیکشن میں سرگرم حصّہ لیا۔

سیاسیات میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے جمعیۃ علماء کی اس اسکیم سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس کے بزرگوں کی دیانت اور خلوصِ نیت پر شُبہ کرنا یا اُن پر رکیک ذاتی حملے کرنا سراسر ناانصافی ہے۔

جمعیۃ علماء کے معترضین کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ خود قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ نے بھی ۴۶ء کا الیکشن جیت جانے کے بعد اپنے موقف میں لچک پیدا کرتے ہوئے سر اسٹیفرڈ کرپس کا فارمولا جو جمعیۃ علماء ہند کے فارمولے سے ملتا جُلتا تھا اور جسے سیاسی دُنیا میں "کیبنٹ پلان" کے نام سے شہرت ملی نہ صرف قبول کرلیا تھا بلکہ اُس عبوری حکومت میں شمولیت پر بھی رضامند ہوگئے تھے جس میں کانگریس اور لیگ کو پانچ پانچ عہدے دیئے گئے تھے۔ اور ایک ایک عہدہ سکھوں اور اچھوتوں کے لیے محفوظ رکھا گیا تھا۔[1]

---

[1] "محمد علی جناح" ص ۲۴۹ و ۲۵۰ از ہیکٹر بولائتھو

تیسرا باب

آزادی کے بعد

۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ جیت گئی۔ لاریب۔ اس کے مخالف جمعیۃ علماء اور احرار وغیرہ ہار گئے بلا شُبہ۔ ہارنے والوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اپنی شکست کو تسلیم کرلیا۔

شرافت دُشمن میں بھی ہو تو تسلیم کرلینا چاہیئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد جمعیۃ علماء ہو یا احرار ان کے اکابر نے کبھی پاکستان کے خلاف لب نہیں ہلائے۔ بلکہ ناموافق حالات کے باوجود بھی پاکستان کی ترقی اور اس کے استحکام ہی کے لیے کام کیا۔ اُن کے لیے اس بدیہی حقیقت کو فراموش کرنا غیر ممکن تھا کہ "پاکستان کی مضبوطی سے ہندوستان کے مسلمانوں کی کمر مضبوط ہوتی ہے اور اس کی کمزوری سے وہاں کا مسلمان نڈھال ہوجاتا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ جب مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے کسی نے ایک مجلس میں پوچھا: "حضرت پاکستان کے بارے میں اب آپ کا کیا خیال ہے؟" تو مولانا نے فرمایا: "مسجد جب تک نہ بنے، اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو

مسجد ہے[1]۔" لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ تقسیمِ ملک کے فوراً بعد کا دور ان لوگوں کے لیے بڑا کٹھن تھا۔ بالخصوص صوبہ سرحد کے "مردِ آہن" خان عبدالقیوم خان کی بدولت ان پر جو گزری وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ بہرکیف ان لوگوں نے کھلے دِل سے سیاست کا میدان مسلم لیگ کے حوالے کرکے اپنے آپ کو مساجد و مدارس اور رفاہی کاموں کے لیے وقف کر دیا کہ ع

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

مولانا مفتی محمود تب عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں خدماتِ تدریس انجام دیتے تھے۔ ۵۰ء میں مدرّس کی حیثیت سے مدرسہ "قاسم العلوم" ملتان میں چلے گئے اور آج تک وہیں عہدِ وفا نبھا رہے ہیں۔

قراردادِ مقاصد

پاکستان بناتے وقت دعویٰ تو یہ کیا گیا تھا کہ اسے "اِسلام کی تجربہ گاہ" بنانا مقصود ہے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اِسلام کے زبانی جمع خرچ کے سوا عملاً اسلام کے لیے کچھ بھی نہ کیا گیا۔ اس کے برعکس یہاں غیر اسلامی شعائر فروغ پانے لگے۔ جوگندر ناتھ منڈل (ہندو) اور سر ظفر اللہ خاں (قادیانی) ایسے لوگ قانون اور خارجہ امور کی وزارتوں پر قابض ہو گئے۔ یہ صورتِ حال اگر ایک طرف مولانا حسین احمد مدنیؒ اور امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے خدشات کی تصدیق کر رہی تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد

---

[1] روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی کا "شیخ الاسلام نمبر" ص ۱۷ بابت ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء

عثمانیؒ ایسے اکابر تحریکِ پاکستان کی آرزوؤں کا خون بھی کر رہی تھی۔ جن کا اوڑھنا بچھونا ہی اسلام تھا۔

خدا تعالیٰ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (بانی جمعیتہ علماءِ اسلام) کو اجرِ جزیل عطا فرمائیں، جنہوں نے اس افسوسناک صورتِ حال کا بروقت نوٹس لیا اور ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے ایک اصولی قرارداد منظور کرائی۔ جو "قراردادِ مقاصد" کے نام سے موسوم اور مشہور ہوئی۔ جس میں تسلیم کیا گیا کہ "اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کے بلا شرکتِ غیر حاکمِ مطلق ہیں" اور یہ کہ "اُسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر نیابتاً عطا فرمایا ہے۔" واضح کیا گیا کہ "جمہورِ پاکستان کی نمائندہ یہ مجلسِ دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خودمختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے جس کی رُو سے مملکتِ جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ جملہ اختیارات و حقوقِ حکمرانی استعمال کرے۔ جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو جس طرح کہ اسلام نے اُن کی تشریح کی ہے پُورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔ جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن اور سُنتِ نبویؐ میں متعین ہیں ڈھال سکیں۔"

اس قرارداد کی منظوری نے جہاں قوم کی اسلام کے ساتھ والہانہ شیفتگی اور غیر متزلزل اعتقاد کو ظاہر کیا وہاں اسمبلی میں علماء کا رسُوخ بھی آشکارا کر دیا۔ اسلام اور پاکستان دُشمن طاقتوں نے اسے اپنے خلاف "ٹائم بم" سمجھا اور علماء کے اثر کو سیاست سے خارج کرنے پر تُل گئیں۔ "اِقبال اور مُلّا" قسم کے

کتابچے اُسی دور کی پیداوار ہیں کہ جو لوگ دِل سے اسلام کو نہیں چاہتے وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے "مُلّا" ہی کو آڑ بنا کر اِسلام کو مسترد کرتے ہیں ۔

جمعیۃ علماء اِسلام کا احیاء

موسم ناخوشگوار اور موجیں متلاطم ہوں تو کشتی کھینا بڑے دِل گُردے کا کام ہے ۔ پاکستان بن جانے کے بعد بالخصوص "قراردادِ مقاصد" کی منظوری کے بعد ملکی سیاست سے اسلام اور علماء کو جس طرح خارج کرنے کی کوشش کی گئی وہ کوئی ڈھکی چھُپی بات نہ تھی ۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ان حالات میں جمعیۃ علماء اِسلام کے احیاء کا فیصلہ کیا ۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس نئے سفر کی راہ میں دیوبند مکتبِ فکر کے تمام علماء باہم مِل کر قدم اُٹھائیں ۔ لیکن اس دور کے سیاسی اُٹھاؤ پٹخ نے بیل منڈھے نہ چڑھنے دی ۔ دسمبر ۵۲ء میں جمعیۃ کے بزرگوں نے ناخوشگوار حالات کے باوصف اپنی کشتی کے بادبان کھول دیئے اور مُلتان میں جمعیۃ کا ایک کنونشن طلب کر لیا ۔ جس میں جمعیۃ کی از سرِ نَو تنظیم کی گئی ۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ صدر اور مولانا احتشام الحق تھانوی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے[1] ۔ مولانا مفتی محمود بھی اس نئے سفر میں شامل ہو کر راہِ شوق میں آبلہ پائی کرنے لگے ۔

عُلماء کا شاندار کارنامہ

اس دور کا ایک اہم اور قابلِ ذکر واقعہ ۳۱ علماء کا وہ بائیس نکاتی دستوری

---

[1] "منشور" جمعیۃ علماء اسلام عنوان "جمعیۃ کا پہلا انتخاب"

خاکہ ہے جو (۲۱ر تا ۲۴ر جنوری ۱۹۵۱ء) کراچی میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیرِ صدارت مرتب اور مدوّن کیا گیا۔ جہاں تمام مکاتبِ فکر کے نامور علماء اکٹھے ہوتے مثلاً مولانا مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا عبد الحامد بدایوانیؒ، پیر صاحب مانکی شریف، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ، مفتی جعفر حسین مجتہد، مفتی کفایت حسین مجتہد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ۔ اس دستوری خاکے میں کہا گیا:

۱۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

۲۔ ملک کا قانون کتاب و سُنّت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جائے گا جو کتاب و سُنّت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سُنّت کے خلاف ہوں تو اس کی تصدیق بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک مُعیّنہ مدت کے اندر ممنوع یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

۳۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ اِس اصول اور مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

۴۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ کتاب و سُنّت کے بتائے ہوئے معروفات قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور متعلقہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور قیام کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگار ہوں۔ بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷۔ باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظِ جان و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہار رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا۔ اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقع صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹۔ مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اُنھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے اُن کے

شخصی معاملات کے فیصلے اُن کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے۔ اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب، عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور اُنہیں شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیت کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہیں اُن کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے۔ اُن میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔ رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے۔ جس کے تدین، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا اُن کے منتخب نمایندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔ رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کرسکتا ہے۔

۱۴۔ رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمایندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض سرانجام دیگا۔

۱۵۔ رئیسِ مملکت کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کُلّاً یا جُزاً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔ جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہ کثرتِ آرا سے اُسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔ ارکانِ و عُمّالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایسا ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔ محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا۔ تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصُول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکتِ واحدہ کے اجزاءِ انتظامی متصور ہوں گے۔ اُن کی حیثیت نسلی، لِسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی۔ جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپُرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر اُنہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر مُعتبر نہ ہوگی جو کتاب و سُنّت کے خلاف ہو۔

علماءِ کرام نے مطالبہ کیا کہ اسلامی مملکت کے دستور میں ان بائیس اصُولوں کی تصریح لازمی ہے۔ ان کے بغیر کوئی دستور نہ تو اسلامی ہوگا نہ جمہُوری۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بائیس نکاتی اسلامی دستوری خاکہ ہمارے علماء کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔ اور اُن لوگوں کے لیے ایک طمانچے سے کم نہیں جو یہ بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ علماء کبھی ایک دستوری خاکے پر متفق نہیں ہو سکتے۔ جو شخص یہ کہے کہ علماء اکٹھے نہیں ہوتے اُس کے سامنے یہ دستوری خاکہ رکھ دو وہ خود بخود بھاگ جائے گا۔

افسوس ہمارے حکمرانوں نے اس کی قدر نہ کی اگر ہمارے حکمرانوں نے ملک کا آئین اس خاکے کے مطابق تشکیل دیا ہوتا تو آج یہاں اسلام کی حکمرانی ہوتی۔ اور ہمارا ملک کبھی دولخت نہ ہوتا۔

تحریکِ ختمِ نبوت

پاکستان میں اسلام کا نفاذ کیا ہوتا۔ یہ تو دُنیا کا وہ بدنصیب ملک تھا، جہاں قصرِ نبوت میں کھلے بندوں نقب لگ رہی تھی۔ جس کا وزیرِ خارجہ مجمعِ عام میں " قادیانی نبی" کے فضائل بیان کرتا اور اُمتِ مسلمہ پر کفر و ارتداد کے دروازے کھولتا تھا۔ جس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ قائدِ اعظمؒ تک کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے اِنکار کر دیا تھا۔ کہ اُس کے عقیدہ کے مطابق وہ مسلمان نہ تھے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن) ایک طرف یہ ہو رہا تھا تو دُوسری طرف پاکستان کو بلقانی ریاستوں کی طرح تقسیم کرنے کی درپردہ سازشوں (گلوبل سٹریٹیجی) کو کھلے بندوں آب و دانہ مہیا کیا جانے لگا۔ کشمیر کے بعد بلوچستان قادیانی خلیفہ کی تُرکتازیوں کا مرکز بن گیا۔ قادیانیوں کی ان اشتعال انگیز سرگرمیوں میں روز بروز کے اضافے کے باعث احتساب کی قدرتی چکی نے اپنا عمل شروع کیا اور ملک بھر میں قادیانیوں کے خلاف ایک غضب ناک عوامی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تحریک کے مقاصد میں یہ تین چیزیں داخل تھیں (۱) عقیدہ ختمِ نبوت کو دستوری تحفظ دیا جاتے (۲) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جاتے (۳) اور سر ظفر اللہ خاں کی طرح کلیدی ملازمتوں پر فائز قادیانیوں کو برطرف کیا جاتے ـــــــ یہ پاکستان کی پہلی اہم ترین دینی تحریک تھی جو ۵۳ء میں شروع ہوئی۔ اگرچہ بظاہر حکومت نے اس تحریک کو نہایت

بے رحمی کے ساتھ کچل دیا مگر فی الحقیقت مسلمانوں نے بیش بہا جانی ومالی قربانیاں دے کر لادینی ذہنیت کو شکستِ فاش دی اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے آئینی تحفظ کا مستقل موقف قائم کر دیا۔

مولانا مفتی محمودؒ نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور اس "جرم" کی پاداش میں ایک سال قید کی سزا پائی۔ آپ کو ملتان جیل میں رکھا گیا۔ یہ مفتی صاحب کی پہلی قید تھی۔

جمعیۃ کی تنظیمِ نو

جب مفتی صاحب اور ان کے بزرگ تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں قید کاٹ کر باہر آئے تو پوری جماعت مضمحل ہو چکی تھی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی تحریکِ ختمِ نبوت سے اختلاف کی بناء پر جمعیۃ سے علیحدہ ہو گئے تھے آخر دو سال کی تگ و دو کے بعد ۵۴ء میں "انٹی" پھر کاتی گئی۔ اور مولانا مفتی محمد حسنؒ صاحب کو جمعیۃ کا صدر منتخب کیا گیا۔ مفتی صاحب بیمار اور معذور تھے۔ انہوں نے مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب کو قائم مقام صدر نامزد کر دیا۔ یہ قیادت بوجوہ کچھ زیادہ اور مؤثر کام نہ کر سکی۔ چنانچہ دو سال بعد اکتوبر ۱۹۵۶ء میں حضرت مفتی محمد حسنؒ نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ کی معرفت ایک تحریری پیغام کے ذریعہ نئے انتخابات کرانے کی ہدایت فرمائی اور اس طرح جید علماء کے ایک کنونشن (منعقدہ ملتان) میں مولانا احمد علی لاہوریؒ کو دوبارہ صدر منتخب کیا گیا اور مولانا غلام غوث ہزاروی جنرل سیکرٹری منتخب

---

[1] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء ص ۵۱

ہوئے[1]۔ اس کنونشن میں شرکت کے لیے مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا احتشام الحق تھانوی کو بھی دعوت دی گئی۔ مگر یہ دونوں بزرگ شریک نہ ہوئے۔ تاہم تنظیمِ جدید کی پُرجوش مساعی سے مغربی پاکستان میں جمعیۃ کے دو ہزار مدرسے اور اتنی ہی شاخیں قائم ہوئیں۔ اب جمعیۃ ایک فعال جماعت کا رُوپ لے چکی تھی[1]۔

۵۶ء کا آئین

اس دوران میں ۵۶ء کا آئین نافذ ہوا۔ اس دستور کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے "رہنمایانِ قوم" کس طرح اسلام کے نام پر قوم کی آنکھوں میں دُھول جھونکتے رہے۔ اس دستور کی تمہید میں اگرچہ پاکستان کو اسلامی مملکت اور "قرار دادِ مقاصد" کو رہنما اصُول کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ مگر ساتھ ہی یہ لکھ کر کہ:

> "(یہ) تمہید دستوُر کا جزوِ لاینفک نہیں، بلکہ محض ایک دیباچہ ہے جس کو کوئی قانونی اہمیت حاصل نہیں[2]۔"

اسلام کا مضحکہ اُڑایا گیا۔ جمعیۃ علماء نے اس دستوُر کو اسلامی دستوُر کے طور پر قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے حکم پر ملتان میں جید علماء کا ایک اجلاس ہوا اور ۵۶ء کے دستور سے خلافِ اسلام دفعات کو تبدیل کرانے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ جس نے

---

[1] "منشور" جمعیۃ علماء اسلام عنوان "جمعیۃ کا دوسرا و تیسرا انتخاب"۔

[2] "اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا دستور" ص ۲ ناشر قانونی کُتب خانہ لاہور

۵۶ء کے دستور کا مکمل جائزہ لے کر دستوری ترامیم پر مبنی اپنی رپورٹ شائع کی۔

۵۸ء کا مارشل لاء

جس قوم کے راہبر راہزنی پیشہ کر لیں۔ اس کی عزّت کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے۔ مرحوم لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد سات سال کے مختصر عرصہ میں جس طرح سات آٹھ وزارتیں بنیں اور ٹوٹیں۔ انہوں نے ملکی سیاست کا دیوالیہ نکال دیا۔ فروری ۵۹ء میں انتخابات ہونا قرار پائے۔ امید بندھی کہ شائد حالات پلٹا کھا جائیں، اربابِ جمعیۃ نے بھی ان انتخابات میں جماعتی بنیادوں پر حصّہ لینے کی تیاریاں مکمّل کر لی تھیں۔ اس دوران جمہوریت کے خلاف پھر سازش ہوئی اور ۷؍ اکتوبر کو اسکندر مرزا نے جو اُس وقت صدرِ مملکت تھے۔ نون وزارت کو برطرف کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ آئین شکست اور سیاسی جماعتیں معطّل ہو گئیں، ۲۷؍ اکتوبر کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خاں نے اسکندر مرزا کو چلتا کیا اور خود صدرِ مملکت بن گئے۔ یہ پاکستان میں پہلا ملک گیر مارشل لاء تھا۔ اقتدار کی ہوس بڑی نامراد چیز ہے جس دل میں گھر کر لے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ اگرچہ ایوب خاں کا واپس بیرکوں میں جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ تاہم لوگوں سے کہتے ہیں اپنا مشن ختم کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ پاکستان کے لوگ (بالخصوص پنجاب کے رہنے والے) جس قدر بھولے ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم ڈھونڈے سے نہ ملے گی انہوں نے ایوب خاں کے خوشنما وعدوں پر اعتبار کر لیا۔

مارشل لاء کے باعث چونکہ سیاسی جماعتیں پابند (BAN) اور سیاسی سرگرمیاں معطّل کر دی گئی تھیں۔ اس دوران میں جمعیۃ علماء کے بزرگوں نے دینی اقدار

کے تحفظ کے لیے "نظام العلماء" کے نام سے ایک تنظیم قائم کر دی۔ جس نے عائلی قوانین کے جبری نفاذ کے سلسلہ میں ایوب خاں کی شدید مخالفت کی۔ اور حکومت کی دار و گیر کا ہدف بنی [1]

وفاق المدارس الاسلامیہ

انگریز نے علماء کا وقار ختم کرنے کے لئے جو چالیں چلیں اور اُن سے جو نقصان ہوا وہ ہندوستان کی سیاسی و دینی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے، یہ دینِ مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کی دلیل ہے۔ کہ انگریز کی تمام تر کوششوں کے باوجود بفضلہٖ تعالیٰ پورے برِّ صغیر میں جا بجا مدرسے اور مسجدیں آج بھی انہی علماء کے دم قدم سے آباد ہیں۔ مگر مدارسِ دینیہ کے نصاب و نظامِ تعلیم میں جو ضعف و انحطاط پیدا ہو چکا ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا اور اس کی اصلاح نہ کرنا دلیلِ دانائی نہیں۔ کوئی دانا و بینا شخص جسے دین کے ساتھ کچھ بھی ہمدردی ہے وہ اس صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ مولانا مفتی محمود کو قدرت نے حسّاس دل اور ہر لحظہ متحرک جسم سے نوازا ہے۔ انہوں نے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان کے اُن تمام مدارسِ دینیہ کے سربراہوں کا جن کا فکری رشتہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھا۔ ملتان میں ایک اجلاس بلایا۔ مغربی پاکستان کے سرکردہ علماء نے مدارس کی اصلاح و ترقی کے لئے "وفاق المدارس العربیہ" کے نام سے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ جسے ایک طرح کی دینی یونیورسٹی کہنا چاہیئے۔ مولانا مفتی محمود یومِ تاسیس سے اب تک اس کے جنرل سیکرٹری چلے آرہے ہیں۔

---

[1] "منشور" جمعیتہ علماء اسلام عنوان " مارشل لاء کا نفاذ"

بھٹو صاحب نے اپنے دورِ اقتدار میں جب دینی مدارس پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو مولانا مفتی محمودؒ نے اس کی زبردست مزاحمت کی تب ’’وفاق المدارس العربیہ‘‘ کی اہمیّت و افادیت اور زیادہ اُبھر کر سامنے آئی۔

چوتھا باب

اسمبلی کے ایوان میں

جنرل ایوب خاں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بی ڈی سسٹم کے ذریعہ قوم پر آمریت کی کاٹھی ڈال لی۔ اور اپریل ۱۹۶۲ء میں اس نظام کے تحت قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کرائے۔ مفتی صاحب نے ان میں انفرادی حیثیت سے حصہ لیا۔ کیونکہ سیاسی جماعتوں پر ہنوز پابندی تھی۔ مفتی صاحب نے اپنے مخالف تمام امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کراتے ہوئے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کے مقابلے میں صرف ایک امیدوار نوابزادہ فتح اللہ خاں اپنی ضمانت بچانے میں کامیاب ہوئے جن کے ووٹوں کی تعداد بھی مفتی صاحب کے ووٹوں سے نصف تھی[1] ملک بھر میں یہ خبر نہایت حیرت سے سنی گئی۔

اس الیکشن میں بعض دلچسپ واقعات بھی پیش آئے۔ مفتی صاحب کے

---

[1] روزنامہ "حریت" کراچی کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ۱۵ مئی ۱۹۷۲ء

ایک مدِمقابل نے جنہیں اپنی قانون دانی پر بہت ناز تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کے جلسہ میں جہاں تمام اُمیدوار مدعو تھے، کہا:

> "مجھے کسی کے علم و تقویٰ پر اعتراض نہیں، میں اپنے لئے صوفیت اور صالحیت کا بھی مدعی نہیں، . . . . لیکن یہ قانون ساز اسمبلی ہے، اس میں تو وہی نمائندہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جو قانون جانتا ہو۔ دیکھئے اگر آپ کو ہوائی جہاز کے لئے کسی پائلٹ کی ضرورت ہو تو یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ وہ اس فن میں کتنی مہارت رکھتا ہے، اس کا نمازی یا پابندِ زکوٰۃ ہونا تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے" وغیرہ

اکثر دنیا دار سیاستدان اس قسم کی باتیں کر کے سادہ لوح عوام کو ورغلا لیتے ہیں۔ مگر یہاں مقابلہ مفتی محمود سے تھا۔ انہوں نے اس منطق کو خُوب رگیدا۔ مفتی صاحب نے کہا۔

> "میرے دوست نے جو اصول بیان کیا کہ ہر کام کے لئے اس فن کے ماہر کو منتخب کر لینا چاہیئے۔ مجھے اس سے ذرّہ بھر اختلاف نہیں مجھے یہ تسلیم کرنے میں بھی ہرگز پس و پیش نہیں ——— ——— کہ قانون ساز اسمبلی میں قانون دان حضرات کو بھیج دینا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اس ملک میں کوئی قانون جاری کرنا ہے یا اسلامی قانون کا نفاذ مطلوب ہے؟ اگر اسلامی اور صرف اسلامی قانون ہی بنوانا یا بالفاظِ صریح جاری کرانا مقصود ہے تو انہی لوگوں کو بھیجیں جو اسلامی قانون میں مہارت رکھتے ہیں"۔

مفتی صاحب کے ان الفاظ نے ہال کی کایا کلپ کر دی۔ اصول بتلانے والے

صاحب منہ تکتے رہ گئے۔ اور بی ڈی ارکان نے اس اصول کو پلّے باندھ لیا۔ ایک بڑے وکیل صاحب جو خود بھی امیدوار تھے۔ پینترا بدل کر بولے "مفتی صاحب نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ اسلامی قانون کو صرف وہی جانتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بھی اسلامی لاء پڑھایا جا رہا ہے۔ ہمیں بھی مشہور یونیورسٹیوں سے اسلامی فقہ کی سند ملا کرتی ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اسلامی قانون کیا ہے۔" مفتی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں نے شخصیات کی بحث نہیں کی۔ میں نے ایک اصول بتلا دیا ہے، کہ پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے لئے ایک ایسا نمائندہ بھیجئے۔ جو موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق کرا دینے کی اہلیّت رکھتا ہو اور اس پر اسلامی قانون سمجھنے کے سلسلہ میں آپ لوگ اعتماد کر سکتے ہوں۔ رہا شخصیات کا معاملہ تو یہ فیصلہ ان لوگوں نے کرنا ہے کہ کس پر اس سلسلہ میں اعتماد کریں۔ اگر یہ لوگ آپ پر فقہِ اسلامی کے ماہر ہونے کا اعتماد کرتے ہیں۔ تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟[1]"

حزبِ اختلاف

ایوب خاں کی اسمبلی میں حزبِ مخالف کی حیثیت سے کردار ادا کرنا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہر رکن پولیس کی نظروں میں ہوتا۔ حکومت لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتی۔ لیکن مفتی صاحب نے بادِ مخالف کی تمام تر تُندی و تیزی کے باوجود اسلام اور آزادئ اظہار کا چراغ اس جرأت سے روشن کیا کہ اپنے پرائے سب دنگ رہ گئے۔

مفتی صاحب نے قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں حلفِ وفاداری کے موقع پر ہی ایوب خاں کے غیر اسلامی، غیر جمہوری اور آمرانہ دستور کے خلاف بغاوت کر دی انہوں نے حلف نامے کے اس جملے کے بعد کہ "دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا"۔ ابھی

---

[1] ماہنامہ "تبصرہ" لاہور کا "مفتی محمود نمبر" ص ۲۲ و ۲۳ بابت ماہ جنوری ۱۹۷۰ء

طرف سے ان الفاظ کا اضافہ کیا: "اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ ہم اس کو جُوں کا تُوں رکھیں گے بلکہ اس دستور کے دیئے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لا کر اُن جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو کہ کتاب و سُنّت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی، ان میں ترمیم و تنسیخ کریں گے"۔

مفتی صاحب کے یہ الفاظ حلف کی کارروائی میں باقاعدہ درج ہوئے، اور اُن کی نکتہ آفرینی، سیاسی بصیرت اور حق گوئی و بے باکی کے ہمیشہ کے لئے گواہ بن گئے۔

مفتی صاحب نے آزاد خارجہ پالیسی، بجٹ اور عائلی قوانین پر جو تقریریں کیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ انہوں نے بنیادی حقوق کے بل میں آزادئ مذہب کی شق پر شدید اعتراض کیا۔ کیونکہ اس طرح ارتداد کا دروازہ کھلتا تھا۔ انہوں نے اس دفعہ میں یہ ترمیم پیش کی کہ: "کسی مسلمان کو مرتد ہونے کی اور ملک میں ارتداد کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی"۔ مفتی صاحب نے دستور میں سربراہِ مملکت کے لئے مسلمان ہونے کی ترمیم پیش کر کے اُس چور دروازے کو بند کر دیا۔ جس کے ذریعے پاکستان ایسی خالص مسلم ریاست کا سربراہ کسی وقت غیر مسلم بھی بن سکتا تھا۔

معرکۂ حق و باطل

خلافِ اسلام عائلی قوانین پر حکومت اور مولانا مفتی محمود کے مابین اسمبلی میں جو معرکہ لڑا گیا وہ مفتی صاحب کے سوانح کا ایک تابناک باب ہے۔ مفتی صاحب نے یہ جاننے کے باوجود کہ ایوب خاں اس مسئلے کو ذاتی وقار کا سوال بنا چکا ہے، اس آرڈی ننس کو آڑے ہاتھوں لیا اور چاروں شانے چت کر دیا۔

مفتی صاحب نے اس موقع پر ایک معرکہ آراء تقریر کی جو ایک گھنٹہ دس

منٹ تک جاری رہی۔ جس میں اسلام کے عائلی نظام کا ایک ایک گوشہ زیر بحث آیا۔ تمام ایوان اس ایمان افروز تقریر کی رَو میں بہہ رہا تھا۔ اس مسئلہ پر حکومت کی شکست یقینی ہوگئی۔ مگر اقتدار کے فرمانبردار ڈپٹی اسپیکر نے کمال "ہنرمندی" سے کام لیکر رائے شماری کو اگلے وقت پر ڈال دیا۔ اس دوران حکومت اگرچہ "ضمیر فروش نمائندگانِ قوم" کا ضمیر خرید کر اس "لعنت" کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئی لیکن عوامی سطح پر ایوب خاں کی شہرت کو جو نقصان پہنچا۔ خود ایوب خاں نے اپنی خودنوشت میں دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے، نتیجۃً مفتی محمود ایوب خاں کو خار کی طرح کھٹکنے لگے اور آئندہ چل کر انہیں سزا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

ایک اتہام

آجکل کی سیاست کیا ہے؟ جھوٹ کا کاروبار ہے، اپنا دامن اُجلا رکھنے کے لئے دوسروں پر چھینٹے اڑانا یہاں کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ ۶۲ء کے آئین میں ترمیم کے مسئلہ پر مفتی محمود کو یار لوگ اب تک ملاحیاں سناتے ہیں کہ "انہوں نے ایوب خاں کی حمایت کی" کچھ مہربان دو قدم آگے بڑھکر کہتے ہیں "اس کے عوض ٹیوب ویل بھی لئے"، مسلمان حُسنِ ظن کی نسبت بدظنی کا جلد شکار ہوتا ہے۔ لوگ ہاتھ کان پر دھر کر کہتے ہیں" ان مولویوں سے خدا بچائے"، خیر یہ تو تھی سخن گسترانہ بات۔ اب حقیقت سنیئے۔ ۱۹۶۲ء کے دستور میں یہ دفعہ شامل تھی کہ پانچ سال کے بعد صدارتی انتخاب ہوگا۔ اور اگر موجودہ صدر انتخابات میں حصّہ لینا چاہیں تو انہیں انتخابات سے چار ماہ قبل صدارت سے مستعفی ہوکر قومی اسمبلی کے اسپیکر کو صدر کا عہدہ سونپنا ہوگا۔ اور انتخابات کے عبوری دور میں اسپیکر ہی نظمِ مملکت کو چلانے کا ذمہ دار ہوگا۔ حکومت نے آئین میں ترمیم پیش کی۔ کہ

ایوب خاں ملک کے بدستور صدر رہیں اور چار ماہ کے لئے اسپیکر کو قائمقام صدر نامزد نہ کریں۔ اپوزیشن پارٹیوں کا موقف یہ تھا کہ ایوب خاں عبوری دور میں صدر رہے تو وہ سرکاری مشینری کو استعمال کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہوں گے، اور الیکشن غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکیں گے۔ مفتی محمود صاحب کو قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے اس ترمیمی بل کے حق یا مخالفت میں ووٹ دینا تھا۔ انہوں نے اپنی جماعت کا اجلاس طلب کیا اور ذمہ دار عہدیداروں کو بل کے مندرجات پر غور کرنے کے لئے کہا۔ اُن کی جماعت نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا۔ کہ بل کے حق میں ووٹ دیا جائے۔ اس فیصلے کی دو بنیادی وجوہ تھیں، ایک مذہبی اور ایک سیاسی

(ا) دستور میں صدر کی طرح اسپیکر کے لئے مسلمان ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی، اس طرح دستور کی مندرجہ بالا دفعہ کے تحت غیر مسلم اسپیکر پاکستان کا صدر بن سکتا تھا جو جمعیتہ کے نزدیک مذہبی اعتبار سے کسی طور مناسب نہ تھا،

(ب) سیاسی پہلو یہ تھا کہ جب اسّی ہزار بی ڈی ممبروں کا منتخب نمائندہ ملک کا جائز صدر نہیں ہو سکتا۔ تو پھر قومی اسمبلی کے ڈیڑھ سو ممبروں کے منتخب نمائندے کو کیسے یہ حق دے دیا جائے کہ وہ (عبوری دور کے لئے ہی سہی) کرسئ صدارت پر متمکن ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دستور میں کہیں یہ شرط نہیں تھی۔ کہ اسپیکر قائمقام صدر ہونے کے بعد صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کہ کوئی اسپیکر جسے چار ماہ کے لئے صدر نامزد کیا گیا ہو اگر وہ صدارتی انتخاب لڑنا چاہے تو ایسا کر سکتا تھا۔ اور قائم مقام صدر کی حیثیت سے سرکاری مشینری کو اپنے حق میں استعمال بھی کر سکتا تھا۔ گویا جس خطرے سے بچنے کے لئے اپوزیشن ترمیم لائی تھی وہ "خطرہ" اس ترمیم کے باوجود اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ان وجوہ کے تحت مفتی صاحب نے اپوزیشن کی اس ترمیم کے حق میں ووٹ نہ دیا جو متعدد

قباحتوں کی حامل تھی ۔ اور اس کے مقابلے میں ترمیم پیش کی کہ اسمبلی باقاعدہ ایک نائب صدر کا عہدہ اور اس کے مسلمان ہونے کا قانون پاس کرے ۔ اس کا فیصلہ قارئین خود کر سکتے ہیں کہ مفتی صاحب اس قضیے میں حق بجانب تھے یا نہیں؟

پانچواں باب

مفتی محمود مصر میں

۱۹۶۴ء میں ”جامع الازہر“ مصر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر حکومتِ مصر نے دنیا بھر کے جید علماء کو مصر آ کر اس جشن میں شمولیت کی دعوت دی۔ پاکستان سے جو وفد مولانا محمد یوسف بنوری کی زیرِ قیادت اس تقریب میں شرکت کے لئے مصر گیا، مولانا مفتی محمود بھی ایک معزز رکن کی حیثیت سے اس میں شامل تھے، اس اجتماع میں مختلف موضوعات و مباحث پر تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ اور ان مقالوں پر پوری آزادی سے جرح و تنقید اور بحث و تشریح کا سب ارکان کو موقع دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ”موجودہ دور میں کن وجوہ کے باعث اسلام کی اشاعت کمزور پڑ گئی ہے؟“ ایک مغربیت زدہ سوڈانی عالم نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنے مقالے میں یہ دو وجہیں بیان کیں:

۱۔ اسلام نے غلامی کو جائز رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے دنیائے کفر کو اسلام

سے عداوت اور نفرت پیدا ہو چکی ہے،

۲۔ اسلام تعدّدِ ازدواج کی اجازت دیتا ہے، اس کے باعث بھی یورپ اسلام سے بدظن ہو گیا ہے،

سوڈانی عالم کی بیان کردہ نام نہاد وجوہ کے ردّ کا شرف دو پاکستانی علماء کو نصیب ہوا۔ مولانا مفتی محمود نے تعدّدِ ازدواج اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے غلامی والے حصہ پر بحث کی۔ ان دونوں علماء نے جس طرح وہاں اسلام کا حقِ نمائندگی ادا کیا علمائے اسلام آج تک اس کو یاد کرتے ہیں۔[1]

مجمع البحوث الاسلامیہ میں تقریر

مفتی صاحب نے تین بار مصر کا دورہ کیا۔ "مجمع البحوث الاسلامیہ" کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ قاہرہ میں انہوں نے اسلام اور پاکستان کی جو عظیم خدمت انجام دی اور جس طرح کشمیر کا مسئلہ اس عالمی مؤتمر میں اٹھایا وہ انہی کا حصہ تھا۔ چالیس اسلامی ممالک کے ایک سو سے زائد علمائے رُوبرو جن کی صدارت "الازہر" کے ریکٹر الشیخ حسن مامون کر رہے تھے، ایک وقیع تقریر کی۔ آپ نے کہا۔

معزّز حضرات!

میں سب سے پہلے جامعہ ازہر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں اس بلند مقام میں مل کر بیٹھنا میسر کیا۔ اور علمائے اسلام کو اسلام کے دفاع اور دینی مشکلات کے حل کرنے کے لئے جمع کیا۔ جامعہ ازہر ہی اس عظیم منقبت کے لائق ہے۔ کیونکہ یہ وہ قدیم علمی مدرسہ ہے۔ جس نے تمام ممالک میں خواہ نزدیک

---

[1] ماہنامہ "تبصرہ" لاہور بابت مارچ ۱۹۶۹ء ص ۹ "تاریخ دارالعلوم دیوبند" ص ۸۳ از مولانا قاری محمد طیّب۔

ہوں یا دَورِ اسلامی علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ تک اسے محفوظ و مضبوط رکھے۔ اور سپاہِ اسلام اور اسلامی عساکر کے لئے مضبوط قلعہ کی حیثیت سے قائم رکھے۔

فتنۂ الحاد

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے قطعی مسائل میں الحاد و تحریف کا فتنہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور تقریباً تمام عالمِ اسلام میں پھیل گیا ہے، اور میں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ بعض حکومتیں اپنے خصوصی اغراض کی خاطر اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ اس فتنہ کے حاملین یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ بنکوں کا سود جائز اور حلال ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا۔ یہی لوگ شراب کی بعض قسموں کو حلال کہتے ہیں۔ زکوٰۃ کو عبادت نہیں جانتے۔ بلکہ اس کو ایک مالی ٹیکس کی سی حیثیت دیتے ہیں۔ زکوٰۃ کی مخصوص شرح کو جو شریعت میں منصوص ہے، ضروری نہیں جانتے۔ بلکہ ضروریات کے تحت اس کی شرح میں کمی بیشی کے قائل ہیں۔ نیز یہی لوگ حکومتِ وقت کو کُلّی اختیار دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کی شرح اور اس کی شرائط و حدود اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کریں اور اس میں کمی بیشی کریں۔
لہٰذا میں ممبرانِ مجمع البحوث الاسلامیہ سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ ان مسائل کی صحیح تشریح فرمائیں گے۔ اور تمام مسلمانوں کو اِن واضح گمراہیوں سے نجات دلائیں گے،

مغربی استعمار

تیسری بات یہ ہے کہ مغربی استعماریوں نے افریقہ اور ایشیا میں بڑا اندوہناک فساد پھیلا رکھا ہے اور مسلمان قوم اگرچہ درحقیقت ساری کی ساری

ایک ملت ہے لیکن ان ظالم استعماریوں نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اور ان کو آپس میں دشمن بنا دیا ہے۔ العیاذ باللہ۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات اس کانفرنس میں مغربی استعمار کے خلاف قرار دیں پیش فرمائیں گے۔ اور ان استعماریوں کو مسلمان ملکوں میں دخل دینے سے شدت سے روکیں گے۔

مسئلہ کشمیر

آخر میں میں یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ پاکستان میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ ہے لیکن اس کے باوجود ان کو ایک بڑا مشکل اور اہم مسئلہ درپیش ہے۔ جس نے ان کو حیران و سرگرداں کر دیا ہے اور وہ ہے مسئلہ کشمیر۔ جس کو امریکہ اور برطانیہ کے استعمار نے ہمارے اور ہندوستان کے درمیان پیدا کر دیا ہے۔ مسئلہ کشمیر، مسئلہ فلسطین کے ساتھ بہت مشابہ ہے۔ چالیس لاکھ مسلمان آج بھی کشمیر میں مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی آفت ان کے سر پہ آ پڑتی ہے۔ اور وہاں کے مسلمانوں کے عمائدین سب کے سب جیلوں میں ہیں۔ جیسا کہ فلسطین کا مسئلہ تمام مشرق و مغرب میں بسنے والے مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ بعینہٖ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بھی عالم اسلام کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ حکومتِ پاکستان نے آج تک اسرائیل کی حکومت تسلیم نہیں کی اور نہ آئندہ کسی وقت بھی اس کو تسلیم کر سکتی ہے۔ کیونکہ حکومتِ پاکستان کی نظر میں اسرائیلی باشندے تمام عرب اور اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں۔ لہٰذا ہم تمام اسلامی ممالک بالخصوص حکومت جمہوریہ عربیہ متحدہ (مصر) سے مسلمانانِ کشمیر کو ظالم ہندوؤں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے میں تعاون کی اُمید رکھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان مشرک ہندوؤں کو ذلیل

دشوار کردے"[1]

مفتی صاحب کی اس تقریر کا علماء نے نہایت پُرجوش نعروں کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ "مجمع البحوث الاسلامیہ" کی اس اجلاس کی قرار دادیں گواہ ہیں کہ مفتی صاحب کی تقریر نے انہیں کس قدر متاثر کیا؛ قاہرہ کے اخبارات نے مفتی صاحب کی تقریر جلی سُرخیوں سے شائع کی۔ بھارت مفتی صاحب کی اس تقریر کے مضمرات سے بوکھلا اُٹھا اور "آل انڈیا ریڈیو" نے اس ضمن میں بے سروپا اور حد درجہ شرانگیز پروپیگنڈا کیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ کانفرنس کے چیئرمین الشیخ حسن مامون نے مفتی صاحب کو مسئلہ کشمیر پر اظہارِ خیال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اور جب بھارتی مندوب نے مصر میں مقیم بھارتی سفیر کے کہنے پر مفتی صاحب کی تقریر پر بے معنیٰ اعتراض کیا تو واقعہ یہ ہے کہ اُس کی ایک نہ سُنی گئی حتیٰ کہ مصری اخبارات نے بھارتی نمائندے کے اعتراض کو سرے سے کوئی جگہ ہی نہ دی۔

صدر ناصر کی حمایت

مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں نے جب اپنا ردِّ عمل پیدا کیا اور دنیائے عرب میں جمال عبدالناصر ایسا "خدائی نشتر" پیدا ہوا تو مغرب لرزہ براندام ہو گیا۔ کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوتا۔ جمال عبدالناصر سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ مگر اُس کے عظیم استعمار دشمن کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جمال عبدالناصر لاریب عصرِ حاضر میں عربوں کا سب سے بڑا اور نہایت دلیر و باہمت لیڈر تھا۔ ناصر اور

---

[1] مجمع البحوث الاسلامیہ (قاہرہ) کی دوسری سالانہ کانفرنس" ص ۷ تا ۱۰ مطبوعہ شعبہ نشر و اشاعت جمعیتہ علماء اسلام۔

اس کا مصر پاکستان کے افسوس ناک حد تک مغرب نواز کردار بالخصوص ۵۶ء میں سوئز کی جنگ کے موقع پر حسین شہید سہروردی کی عاقبت نا اندیشانہ پالیسی اور مصر کے خلاف سعودی عرب کو ہتھیاروں کی سپلائی کے باعث بجا طور پاکستان سے نفور تھا۔ مغربی استعمار کے آلۂ کار اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے اور پاکستان میں جمال عبدالناصر کے خلاف فضا پیدا (CREATE) کرتے۔ اُس وقت مولانا مفتی محمود اور اُن لوگوں نے جو غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، نہایت دیدہ وری اور جرأت و بے باکی کے ساتھ جمال عبدالناصر اور مصر کی حمایت کا پرچم بلند کیا۔ اور اس طرح دنیائے عرب پر یہ ظاہر کر دیا کہ پاکستان کے عوام اُن کے دشمن نہیں۔ سرکاری سطح پر ایوب خاں نے قدرے بہتر خارجہ پالیسی اپنائی اور اس طرح مصر کے ساتھ ہمارے تعلقات خاصے برادرانہ ہو گئے۔

چھٹا باب

۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۹ء

۶۵ء کا صدارتی الیکشن

ایوب خان نے ۶۵ء میں بڑی ہوشیاری سے انتخابات کی بساط بچھائی، بی ڈی سسٹم کے ذریعہ وہ اپنی کامیابی پہلے ہی یقینی بنا چکے تھے۔ اب محض ایک "رسمِ انتخابات" ادا ہونا تھی اور ایوب خان کی صدارت کا اعلان ہو جانا تھا۔ اپوزیشن نے "کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز" (C.O.P) کے نام سے متحدہ محاذ بنا لیا۔ متحدہ اپوزیشن کی طرف سے بانیٔ پاکستان مرحوم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ صدارتی امیدوار نامزد ہوئیں۔ ۲؍جنوری ۱۹۶۵ء کو ملک بھر میں زبردست انتخابی معرکہ ہوا۔ مگر نتیجہ وہی نکلا جس کا پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایوب خاں محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کے ۳۶ فیصد ووٹوں کے مقابلہ میں ۶۳ فیصد کی اکثریت سے انتخاب جیت گئے۔[1] ایوب خاں کے دور میں بیلٹ بکس کے تحفّظ کو شدید

---

[1] ایوب خاں کی خود نوشت سوانح حیات ص ۳۹۲۔

نقصان پہنچا۔ محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کی شکست نے عوام کے دلوں میں یہ بات راسخ کردی کہ وہ بی ڈی سسٹم (بالواسطہ طریق انتخاب) کے ذریعہ کبھی بھی ایوب خاں سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ بالخصوص مشرقی پاکستان کے لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ عوام کے دلوں میں ابھرنے والا یہی احساس ایوب خاں کے زوال کی تمہید بن گیا بالفاظ دیگر ایوب خاں جیت کر ہار گئے۔

جمعیۃ کا امیدوار

انتخابی موسم بڑا ایمان شکن ہوتا ہے۔ لوگ قرآن پر حلف اٹھاتے اور بعد میں مکر جاتے ہیں۔ لیلائے اقتدار وہ عشوہ طراز حسینہ ہے جسے اپنے قریب پاکر بڑے بڑے لوگ سب کچھ بھول بھال من موج میں آکر اچھل کود میں لگ جاتے ہیں مگر وہ جماعت جس کا نصب العین ”دین کی بنیاد پر انقلاب“ ہو وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ جمعیۃ والوں میں دنیا لاکھ عیب نکالے۔ مگر اسلام کے ساتھ ان کی سچی وابستگی کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ ایوب خاں کا صدارتی الیکشن جمعیۃ کے عقیدوں اور اصولوں کے لئے ایک چیلنج بن گیا۔ ایک طرف ایوب خاں تھا جس کے بلائے جان ہونے میں کسی کو کلام نہ تھا۔ دوسری طرف اپوزیشن تھی وہ آفتِ ایمان بن گئی۔ کہ اس نے اپنا امیدوار ایک عورت کو نامزد کردیا۔ محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کی بلندیٔ مرتبت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ مگر تھیں وہ عورت اور اسلام عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ”جدید خیال“ لوگ اسے بے شک ”فرسودہ خیالی“ کہیں مگر ”پرانی طرز“ کے لوگوں کے لئے عقیدہ و ایمان ایک ایسی متاع ہے جس پر کوئی سمجھوتا (COMPROMISE .) نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ جماعت جو علماء کی جماعت کہلاتی ہو وہ ایسا کیونکر کرسکتی تھی: اسلام کا تحفظ کرانیا

آسان مگر الیکشن کے جھمیلوں میں آکر اُس کی لاج رکھنا "کارے جاں دارد" سے کم نہیں۔

چنانچہ جمعیتہ نے اپنا الگ اُمیدوار کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔ قرعہ مولانا عبیداللہ انور کے نام نکلا۔ اور وہ صدارتی امیدوار نامزد کر دیئے گئے۔[1] لوگوں نے حیرت واستعجاب سے یہ خبر سُنی اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ "انہوں نے کیا کر دیا ہے؟"

مگر واقعہ یہ ہے کہ اس طرح جمعیتہ کے اکابر دنیا پر یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کہ ہمارا مذہب "الیکشنی" نہیں ہے، دین کا ایک جزئیہ بھی لوگوں کے لئے اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ البتہ دنیا کو دین کے لئے اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا۔ جمعیتہ کا یہ فیصلہ بظاہر ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔ مگر جمعیتہ نے اپنی انفرادی حیثیت منوا کر مستقبل کے سیاسی میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی۔

"مفتی صاحب کی شکست"

ایوب خاں عائلی قوانین کے آرڈی ننس اور خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلہ پر مولانا مفتی محمود کے لگائے ہوئے زخموں کو بھولا نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں انہیں اس کی سزا بھگتنا پڑی۔ اُن کا انتخابی حلقہ جو اُن کا ایک فولادی قلعہ تھا، حکومت کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ۶۵ء کے انتخابات میں مفتی صاحب کو ناکام بنانے کے لئے متعلقہ حکام کو خاص ہدایات دی گئیں۔ مفتی صاحب کہتے ہیں "اُس زمانے میں جہاں ہم ووٹ مانگنے جاتے تھے وہاں ہم سے پہلے پولیس موجود ہوتی تھی۔ حلقے کے بی ڈی ممبران کو متعلقہ تھانوں میں طلب کیا جاتا تھا۔ اور انہیں خوف دلایا جاتا تھا کہ اگر مفتی محمود اُن کے علاقے

---

[1] "مولانا عبیداللہ انورؒ" ص ۵۲ از اشتغاق ہاشمی۔

سے کامیاب ہوا۔ تو اس کی سزا انہیں بھگتنا ہوگی،،[1] اس کے باوجود مفتی صاحب نے الیکشن لڑا اور ثابت کر دیا کہ،

فتح و شکست قسمت سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا،

اگرچہ مفتی صاحب بظاہر یہ الیکشن ہار گئے مگر واقعہ میں یہ ہار بھی اُن کی جیت تھی۔

متحدہ اسلامی محاذ

۶۵ء کی جنگ کے بعد چند دینی جماعتوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ ان جماعتوں میں جمعیتہ علماء، مجلسِ احرار، تنظیم اہلِ سنّت اور جناب کوثر نیازی کی "انجمن تحفظِ پاکستان" جو جناب کوثر نیازی ہی کا دوسرا نام تھا، شامل تھیں ایسے محاذ کی ناکام کوشش ۶۲ء میں بھی ہو چکی تھی۔ شاید یہ محاذ ملک کی کوئی خدمت انجام دے سکتا۔ مگر جلد ہی یہ راز منکشف ہوگیا۔ کہ جناب کوثر نیازی اس محاذ میں کس غرض سے شامل ہیں؟ اور اس طرح یہ محاذ اپنی موت آپ مر گیا۔

بین الاقوامی کانفرنس کا معرکہ

ایوب خاں کی حکومت کی اسلام دوستی اور دین کے ساتھ محبّت کو ظاہر کرنے کے لئے "ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ" کے زیرِ اہتمام فروری ۶۸ء میں ایک "عظیم الشّان" بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد کی گئی۔ راولپنڈی کا ہوٹل انٹر

---

[1] روزنامہ "حریت" کراچی کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ۱۵ ر مئی ۱۹۷۲ء

کانٹی نینٹل" اس مقصد کے لئے استعمال ہوا۔ مفتی اعظم فلسطین، تاشقند، شام، تونس، ترکی اور لبنان تک سے وفود آئے۔ مولانا محمد تقی عثمانی (فرزند مولانا مفتی محمد شفیعؒ) اس کانفرنس کی پانچ روزہ رُوداد میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جناب محمد مسعود صاحب نے انفرادی ملکیّت کے خلاف قرآنِ کریم کی کچھ آیات سے استدلال کیا اور اس کے بعد کچھ احادیث پیش کیں..... مقالہ کے اختتام پر انہوں نے چیلنج دیا...... اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے کھڑے ہوکر صدرِ محفل سے تنقید کی اجازت طلب کی۔ شریکِ صدر جناب رضی الدین صدیقی نے وقت کی تنگی کا عذر پیش کیا تو سامعین پکار اٹھے کہ اس مقالہ پر تنقید کا وقت ضرور ملنا چاہیئے۔ بار بار کے اصرار پہ صدرِ محفل جناب باقوری صاحب (مصرالازہر) نے کہا۔ اگر حاضرین کی اکثریت تنقید کا مطالبہ کرتی ہے تو تنقید کا وقت دے دیا جائے گا۔ اس پر ہر طرف سے آوازیں اٹھنے لگیں کہ تنقید ضرور کرائی جائے۔ لیکن جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے اس کے بعد تنقید کی بجائے یہ اعلان کر دیا کہ "جناب ممتاز حسن صاحب اپنا مقالہ پیش فرمائیں"۔ اس اعلان پر سامعین کا مطالبہ پہلے احتجاج اور چند لمحوں کے بعد اشتعال میں تبدیل ہوگیا۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک مندوب تو کچھ زیادہ برافروختہ ہوگئے اور انہوں نے نشست سے اٹھکر جناب محمد مسعود صاحب کے حق میں نہایت بامحاورہ اردو استعمال کرنی شروع کر دی۔ وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر نے بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا...... جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے اپنی نشست سے اٹھکر صدرِ محفل جناب باقوری صاحب سے کہا،

"ہنگامہ کی یہ صورت افسوس ناک ہے۔ لیکن اگر تنقید کا موقع نہ دیا گیا تو سامعین اپنے اس احتجاج میں حق بجانب ہوں گے اور

اندیشہ ہے کہ صورتِ حال بالکل ہی نہ بگڑ جائے۔ آپ مجھے دس منٹ کے لئے اظہارِ خیال کا موقع دیں۔ تو امید ہے کہ ہنگامہ فرو ہو جائے گا۔ بازاری انداز کا مناظرہ اور جدال و نزاع میرا مقصد نہیں۔ میں صرف سنجیدہ علمی انداز میں اس مقالہ پر تنقید کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ بات جناب باقوری کی سمجھ میں آگئی۔ اور انہوں نے تنقید کی اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر کے بعد مفتی صاحب ڈائس پر نظر آئے تو مجمع پر سکون ہونے لگا۔ اور تقریباً ایک منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ حضرت مفتی صاحب نے سنجیدہ اور متین انداز میں جناب مسعود صاحب کے مقالہ پر تبصرہ کیا۔ ... آپ نے فرمایا۔ انہوں نے جن آیات و احادیث کے حوالے دیئے ہیں۔ خود انہی میں جناب مسعود صاحب کے خیالات کی تردید موجود ہے۔ مثلاً انہوں نے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ سے انفرادی ملکیت کے خلاف استدلال کیا ہے۔ لیکن اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ اس کے آگے یہ جملہ بھی موجود ہے۔ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ حضرت رافعؓ کی جو حدیث انہوں نے پیش کی ہے۔ خود اس میں زمین کو عطیہ کے طور پر کسی مسلمان بھائی کو دے دینے کا حکم ہے، اور ظاہر ہے کہ عطیہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ عطیہ دینے والا اس کا مالک رہا ہو۔ آپ نے فرمایا اسلام میں انفرادی ملکیت پر مجھ سے قبل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ، اپنے مقالے میں بیان فرما چکے ہیں۔ لیکن یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے، کہ اگر انفرادی ملکیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ، عشر، خراج اور انفاق فی سبیل اللہ کے ان تمام احکام کا مطلب کیا رہ جاتا ہے جن سے قرآن و حدیث بھرے ہوئے ہیں"، مفتی صاحب کے جملہ جملہ پر لوگ مسرت و تائید کا اظہار کر رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ کی تقریر کے

بعد مفتی صاحب تحسین و آفرین کی صداؤں میں رخصت ہوگئے [1]

جمعیۃ کی تاریخی کانفرنس

حالات کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں بھلا دیوانے بھی کبھی ترکِ وفا کرتے ہیں۔ ۶۸ء ایوب خان کی حکومت کا دسواں سال تھا۔ اپنے اسلام اور عوام دشمن ہتھکنڈوں کے ذریعہ وہ یہ اطمینان کر بیٹھا تھا۔ کہ اب ملک بھر میں کوئی طاقت اُسے چیلنج نہیں کر سکتی۔ ہر طرف خوف، بے یقینی اور مایوسی کا دَور دَورہ تھا۔ سیاستدان "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مضمون اور سیاست محض ڈرائنگ رُوم کی چیز تھی۔ حکومت اپنی ان کامیابیوں پر نازاں ہو کر دس سالہ جشن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ عین اُس وقت جمعیۃ نے ایک جھرجھری لی اور اپنی پُوری قوت کے ساتھ ایوب خاں کو للکارنے کا فیصلہ کر لیا۔

چنانچہ ۳۔ ۴ اور ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو باغ بیرون موچی دروازہ (لاہور) میں جمعیۃ کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشّان کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام علاقوں سے آئے ہوئے پانچ ہزار علماءِ کرام اور نمائندگان نے شرکت کی۔ رات کے اجلاسوں میں حاضری کا تخمینہ دو لاکھ رہا۔ کانفرنس کے آخری روز ایک عظیم الشان جلوس نکلا۔ علماء کی طرف سے پاکستان میں یہ پہلا زور دار حملہ تھا۔ ملکی اخبارات جن کے نزدیک گویا پاکستان میں علماء کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ بھی اس کانفرنس کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے اور کراچی تک کے اخبارات میں اس کانفرنس کی صدائے بازگشت سُنی گئی۔

---

[1] ماہنامہ "البلاغ" کراچی محرم ۸۸ھ

اس کانفرنس کو جمعیتہ کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے اس کانفرنس نے ایوب خاں کے ایوانِ حکومت و اقتدار کو ہلا کر رکھ دیا۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم اسی تاریخ ساز کانفرنس میں تقریر کرنے کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دُور دراز علاقوں سے آنے والے پُرجوش مندوبین اور اُن کا بے پناہ جذبۂ عمل بتا رہا تھا کہ

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب تھا کہ اب ملکی سیاسیات میں علماء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر مولانا مفتی محمود کل پاکستان جمعیتہ علماءِ اسلام کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔

کامیابی کا آغاز

ملکی سیاسیات میں علماء کے رسوخ کا پہلا شگون ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی برطرفی کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ صاحب حکومت کے "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ" کے ڈائریکٹر، "اسلام" نامی پلندۂ خرافات انگریزی کتاب کے مصنف اور اُس وقت کے وزیرِ قانون مسٹر ایس ایم ظفر کے ہمزلف تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے ملحدانہ افکار و نظریات کے باعث خود بھی رسوا ہوئے اور ایوب خاں کی حکومت کو بھی رسوا کیا۔ جمعیتہ علماءِ اسلام نے تحریف و الحاد کے اس فتنہ کا مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر شہر اور قصبہ میں زبردست محاسبہ کیا۔ مفتی محمود صاحب نے "موتمر عالمِ اسلامی" کے اجلاس منعقدہ قاہرہ تک میں یہ مسئلہ اُٹھایا۔ بالآخر جابر اقتدار کو دس سال میں پہلی بار اسلامیانِ پاکستان کے

سامنے جھکنا پڑا۔ اگرچہ حکومت نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو برطرف کر دیا۔ مگر ساتھ ہی علماء کے بارے میں اس کے دل میں گرہ بھی بیٹھ گئی۔ اور وہ انتقام کی سوچیں سوچنے لگی۔

بہیمانہ تشدّد

اقتدار طاقت کے نشے میں اندھا ہو کر اپنی بربادی کا سامان خود ہی پیدا کر لیا کرتا ہے، ۲۰ دسمبر ۶۷ء جمعۃ الوداع کے روز جمعیتہ کے رہنماؤں نے ملک بھر میں "یوم نظامِ اسلام" منانے کا اعلان کیا۔ لاہور میں مولانا عبید اللہ انور (صاحبزادہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ) کی زیر قیادت جلوس کا پروگرام تھا۔ نمازِ جمعہ کے بعد ابھی جلوس کی صفیں بھی ٹھیک طور پر مرتب نہ ہوئی تھیں کہ عقل کی اندھی پولیس لٹھ لیکر لوگوں کو بے تحاشا پیٹنے لگی۔ بدبخت ڈی۔ ایس۔ پی چیمہ نے اپنے ہاتھوں سے مولانا عبید اللہ انور کو زدوکوب کیا۔ اس ظالم نے مولانا کو اس بُری طرح مارا کہ مولانا "البرٹ وکٹر" میں تین روز تک بے ہوش رہے۔ حتٰی کہ عید الفطر کی نماز بھی بے ہوشی کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔ کئی روز تک پیشاب، پاخانہ اور قے میں خون آتا رہا۔ ملک بھر میں شور مچ گیا۔ ایوب حکومت کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ فی الحقیقت یہ بہیمانہ تشدّد ایوب حکومت کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوا۔

صدر ایوب کی شاطرانہ چال

ہوس اقتدار کا بُرا ہو۔ انسان اس میں پھنس کر پاکیزہ خیالات کا استحصال کرنے سے باز نہیں آتا۔ مولانا عبید اللہ انور پر وحشیانہ تشدّد کے ردِّ عمل سے جب ایوب خاں کے اقتدار کا سنگھاسن ڈولنے لگا تو دسمبر ۶۸ء کے آخری دنوں

میں وہ خود لاہور آیا۔ یہ اندازہ کرکے کہ نفاذِ شریعت کا مطالبہ اُٹھانے کے باعث علماء کو عوام میں سیاسی رسوخ حاصل ہو رہا ہے۔ اُس نے اس کا توڑ سوچنا شروع کیا۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء کو اُس نے گورنر ہاؤس لاہور میں اپنے جماعتی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک شاطرانہ چال چلی اور اعلان کیا:

"میرا ایمان ہے کہ پاکستان میں شرعی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔۔۔۔ میں علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مِل جُل کر بیٹھیں اور اسلامی ضابطہ کا ایک ایسا جامع مسودہ تیار کریں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہو اور جو قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد ملک میں نافذ کیا جائے۔ ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ یہ محض جذبات سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بہت سے نازک پہلو ہیں مسلمانوں کے بہت سے طبقے ہیں جن کے مختلف عقائد اور خیالات ہیں۔ اس لئے ان معاملات پر یکساں قوانین کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک علماء کسی ایک بات پر متفق نہ ہو جائیں۔ علماء قانون دانوں، وکلاء اور عوامی نمائندوں کے مشورہ سے ایسا مسوّدہ تیار کر سکتے ہیں جو ملک بھر میں نافذ کیا جا سکے۔ اگر اُن کے تیار شدہ مسودہ کو عوام کی منظوری حاصل ہو گئی تو میں اس پر دستخط کرکے فخر محسوس کروں گا"[۱]۔

ایوب خان نے اپنی طرف سے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس طرح علماء آپس میں دست دگریبان ہو کر عوام کی نظروں سے گر جائیں گے۔ اور اصل مسئلہ پسِ منظر میں چلا جائے گا۔ مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اور علماء نے بیک زبان ایوب خاں کی ایسی خبر لی کہ وہ آئیں بائیں شائیں کرکے رہ گیا۔

---

[۱] روزنامہ "جنگ" کراچی یکم جنوری ۱۹۶۹ء

مفتی محمود کا جواب

مفتی محمود صاحب نے ایوب خان کے جواب میں کہا:

"مجھے تعجب ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے خلاف سازشی گروہ نے پاکستان کے یوم تاسیس سے لیکر آج تک جس بوگس دلیل کا سہارا لیا تھا آج صدر ایوب خان نے بھی اسی کا اعادہ کر دیا ہے۔ میں صدر ایوب خاں سے پوچھتا ہوں کہ مختلف اسلامی فرقوں کے ۳۱ علمائے کرام نے آئین کے متعلق جن ۲۲ اصولوں کو اتفاق رائے سے طے کیا تھا۔ صدر ایوب خاں نے انہیں اپنے دستور کا حصہ بنایا ہے؟ عائلی قوانین میں ترمیم کے سلسلہ میں قومی اسمبلی کی سب کمیٹی نے (جس میں تین خواتین بھی شامل تھیں) جو ترمیمی رپورٹ اتفاق رائے سے پیش کی تھی۔ کیا اُسے اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش کر دیا گیا تھا؟ گذشتہ عام انتخابات کے دوران بھی صدر ایوب خان نے اسلامی قوانین کے بارے میں سفید کاغذ پر دستخط کرنے کا اعلان کر کے قوم کو "سیاہ" باغ دکھائے تھے۔ لیکن آج قوم کا شعور بیدار ہو چکا ہے۔ وہ اس قسم کی باتوں سے گمراہ نہیں ہو سکتی، اسلام میں ہر فرقہ کے شخصی قوانین کو اُس کے عقیدہ کے مطابق تحفظ حاصل ہے۔ اس لئے مختلف فرقوں کی موجودگی اسلامی قوانین کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مسلم قوم اب بیدار ہو چکی ہے اور اس طرح کی بوگس اور بوسیدہ باتوں سے اُسے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

ایوب خان ان باتوں کا جواب کیا دیتے، اُن کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔

---

[1] ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور بابت ۱۰ر جنوری ۱۹۶۹ء ص ۳

ساتواں باب

جمہوری مجلسِ عمل کا قیام اور جمعیۃ کی شرکت

جمعیۃ نے مئی ۶۸ء سے دسمبر ۶۸ء تک اسلام کے حق میں اور ایوب خان کے خلاف جس پامردی اور استقلال سے جدوجہد کی اُس نے جمعیۃ کو عوام میں خاصا مقبول بنا دیا۔ اب وہ ملکی سیاسیات میں ایک اہم عنصر تھی۔ اس دوران میں پانچ جماعتوں پاکستان عوامی لیگ (نوابزادہ گروپ)، نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی، پر مشتمل ایک متحدہ محاذ "پاکستان تحریکِ جمہوریت" (P.D.M) بھی ایوب خاں کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ مگر اس کا پروگرام جن آٹھ نکات پر مشتمل تھا۔ اُن میں سرے سے ایسا کوئی واضح مطالبہ ہی موجود نہ تھا۔ جس سے سیاسی تبدیلی (یعنی ایوب خان کے ہٹائے جانے) کے مطالبات کا حقیقی مدعا و منشا (اسلامی طرزِ حیات کا نفاذ) ظاہر ہوتا۔ جبکہ سب سے زیادہ ضروری چیز یہی تھی۔ محض ایک خان کو ہٹا کر کسی دوسرے خان کو بٹھا دینا ظاہر ہے۔ دین کی بنیاد پر انقلاب کو جنم نہ دے سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پی۔ڈی۔ ایم کوئی بہت بڑی سیاسی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہی، اُدھر ۷۰ء میں ملک میں انتخابات ہو رہے تھے۔ بدیں وجہ پی۔ڈی۔ایم کے زعماء نے

اپنے محاذ کو زیادہ وسیع کرکے ایک نئے دائرۂ عمل کو تشکیل دینے کی ضرورت محسوس کی۔ تاکہ ایوب خان کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ پی۔ ڈی۔ ایم نے جنوری ٦٩ء کے اپنے ڈھاکہ اجلاس میں اُن تمام جماعتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جو پی۔ ڈی۔ ایم میں شامل نہیں تھیں، انہی دنوں جمعیتہ علماء اسلام مشرقی پاکستان کی صوبائی کانفرنس ڈھاکہ میں منعقد ہو رہی تھی، جس میں مغربی پاکستان کے مندوبین بھی بھاری تعداد میں شریک تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مولانا مفتی محمود پی۔ ڈی۔ ایم کے اجلاس میں شامل ہوں اور دیگر جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی گفتگو میں حصہ لیں۔

پی ڈی ایم کے اجلاس میں انتخابی اشتراکِ عمل کے لئے بات چیت ہوئی۔ مختلف زعماء کی یہ رائے تھی۔ کہ باہم متحد ہو کر ایک متفقہ پروگرام کے تحت کام کیا جائے، مفتی محمود صاحب کی رائے تھی:

- "مثبت اور دیرپا اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ اسلام بناءِ اتحاد ہو۔ اور علماء کے بائیس نکات پروگرام میں شامل کئے جائیں۔
- آئندہ انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس لئے کہ موجودہ نظام میں نہ تو حقیقی و آزادانہ انتخابات ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے ذریعہ موجودہ حاکمیت کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔"

بدقسمتی سے مثبت اور دیرپا اتحاد کے لئے مفتی صاحب کی تجویز کے ساتھ بعض جماعتیں متفق نہ ہوئیں۔ تین دن تک اس پر بحث ہوتی رہی اور بقول مولانا مفتی محمود "مجلسِ عمل کے تمام ممبر گواہ ہیں۔ کہ میں نے ابتدائی تشکیل کے موقع پر تین دن اکیلے اس پر لڑائی لڑی[1]"۔ بالآخر بڑے ردّ و کد کے بعد مستقل انتخابی اشتراکِ عمل کی بجائے ایک محدود سا معاہدہ طے پا گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام جماعتوں کی مشترک مساعی اور عوامی

---

[1] ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور ١٨؍اپریل ١٩٦٩ء ص ٦

تحریک صرف اس ایک نقطہ تک محدود ہو گی کہ ہم موجودہ طریقِ انتخاب کو بدل کر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات اور صدارتی نظام کی جگہ وفاقی پارلیمانی نظام کے قیام کے لیئے دستور میں ترامیم کرائیں۔ اور بس۔ اور جب ایسا ہو جائے تو پھر ہر جماعت اپنے جماعتی پروگرام کے تحت الیکشن میں حصہ لے۔ کیونکہ ہر ایک جماعت کا مقصد اور پروگرام دوسری جماعت سے مختلف ہے، کچھ جماعتیں اس محدود اشتراکِ عمل کے باوجود آخر وقت تک کوشاں رہیں، کہ اُن کے بعض مطالبات متفقہ پروگرام میں شامل کر لیئے جائیں۔ مگر مفتی صاحب نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ "اگر اس محدود مطالبہ کے سوا اور کوئی مطالبہ رکھا جاتا ہے تو سب سے پہلے اسلامی نظامِ حیات کا مطالبہ رکھنا ہو گا"[1]

چنانچہ مذکورہ بالا محدود مقصد کے حصول کے لیئے ۸ر جنوری ۱۹۶۸ء کو "جمہوری مجلسِ عمل" کا قیام عمل میں آیا۔ اور اُس نے یہ آٹھ نکاتی متفقہ فارمولا پیش کیا۔

۱۔ وفاقی پارلیمانی نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔
۲۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات کرائے جائیں۔
۳۔ ہنگامی حالات کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔
۴۔ شہری آزادیوں کی مکمل بحالی، کالے قوانین کا خاتمہ اور یونیورسٹی آرڈی نینس کی فوری تنسیخ۔
۵۔ تمام سیاسی نظر بندوں، قیدیوں، طلباء، مزدور، صحافی بشمول شیخ مجیب الرحمٰن، خان عبدالولی خان اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سب کی فوری رہائی۔ تمام سیاسی مقدمات جو عدالتوں اور ٹربیونلوں کے سامنے پیش ہیں اور سیاسی مقدمات کے سلسلہ میں جاری کردہ وارنٹوں کی فوری تنسیخ۔

---

[1] ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور ۱۸ر اپریل ۱۹۶۹ء ص ۶

۶۔ دفعہ ۱۴۴ کے تحت جاری کردہ تمام احکامات کی فوری تنسیخ۔

۷۔ مزدوروں کے حقِ ہڑتال کی فوری بحالی۔

۸۔ پریس پر عائدشدہ پابندیوں کا خاتمہ، جن میں نیئے ڈیکلریشنوں کی اجازت، ضبط کردہ اخبارات و رسائل، مطابع اور معطل کردہ ڈیکلریشنوں کی بحالی اور "اتفاق" "چٹان" اور "پروگریسو پیپرز لمیٹڈ" کی ان کے اصل مالکان کو واگذاری بھی شامل ہے[1]۔

بہرحال اس موقع پر جو "مشترکہ اعلان" جاری کیا گیا۔ اُس کے سرِ آغاز ہی میں یہ بات تسلیم کی گئی کہ:

> "موجودہ آمریّت نے اسلامی نظامِ حیات سے جان بوجھ کر اور پے درپے انحراف کیا ہے[1]"

اور اعلان کیا گیا کہ:

> "جب تک آزادی کے حامل مکمّل جمہوری حالات کے قیام کے لئے ہمارے مندرجہ بالا (آٹھ) شرائط و مطالبات کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔۔ ...... ہم نے آنے والے انتخابات میں حصّہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے، اور عوام سے بھی ہماری پُرزور اپیل ہے کہ وہ ان انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں۔"

ہماری سیاسی تاریخ میں یہ اتحاد ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ جمعیتہ علماءِ اسلام پہلی دفعہ ایک فعّال سیاسی جماعت کی حیثیت سے اُبھری۔ اور پہلی دفعہ جمعیتہ علمائے اسلام اور جماعتِ اسلامی کے درمیان سیاسی معانقہ ہوا۔ اگرچہ جمعیتہ علماء کے اندر اس اقدام پر کچھ اختلاف رائے بھی پیدا ہوا۔ مگر

---

[1] "جمہوری مجلسِ عمل" کے ڈھاکہ اجلاس کی قرارداد ۸ر جنوری ۱۹۶۹ء

نتائج ظاہر کرتے ہیں، کہ یہ فیصلہ جمعیتہ اور اس کے مقاصد کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا۔

آٹھواں باب

گول میز کانفرنس

"طاقت جب مشورہ و فراست کی بجائے اپنی ذات پر بھروسا کرتی ہے تو اسے زہرہ گداز حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے"۔ ایوب خاں کے ساتھ بھی ہؤا۔ وہ ایوب خاں جو دسمبر ۶۸ء کی آخری تاریخ تک "ہم آخر دم تک موجودہ نظامِ حکومت کی حفاظت کریں گے"[1] کا ناد پھونک رہا اور اپوزیشن کا ذکر نہایت حقارت کے ساتھ کرتا تھا۔ ایک ماہ سے بھی مختصر عرصہ کے عوامی ایجی ٹیشن نے اُس کے تمام کس بل نکال کر رکھ دیئے، یکم فروری ۱۹۶۹ء کو اس کی حالت یہ تھی کہ ریڈیو پر کھڑا کہہ رہا تھا "میں ملک کی سیاسی صورتِ حال سے متعلق تجاویز پر ذمہ دار سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سے بات چیت کرنے کو تیار ہوں"[2] ۵ فروری ۶۹ء کو گویا "جمہوری مجلسِ عمل" کے قیام سے ٹھیک اُنتیسویں دن صدر ایوب خاں نے اپوزیشن کو دعوت دی کہ

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء

[2] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲ فروری ۱۹۶۹ء

۱۷ ر فروری کو مذاکرات کے لئے راولپنڈی آجائیں۔

۱۰ ر فروری کو جمہوری مجلسِ عمل (D.A.C) نے ڈھاکہ میں اپنے ایک اجلاس کے بعد مذاکرات کے لئے کچھ شرائط پیش کیں۔ جنہیں حکومت نے تسلیم کر لیا چنانچہ ۱۶ ر فروری کو "جمہوری مجلسِ عمل" نے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا۔ مگر عین موقع پر شیخ مجیب کی رہائی کے مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ جس کے باعث کانفرنس ۱۷ ر فروری کو شروع نہ ہو سکی۔ ۲۱ ر فروری کو صدر ایوب نے آئندہ الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کیا۔ ۲۲ ر فروری کو "اگرتلہ سازش کیس" جس میں شیخ مجیب ملوّث تھے واپس لے لیا۔ ۲۶ ر فروری کو خدا خدا کر کے کانفرنس کا آغاز ہوا۔ "جمہوری مجلسِ عمل" میں شریک تمام جماعتوں کے دو دو نمائندے اور آزاد سیاستدان شریکِ اجلاس ہوئے۔ مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ مگر انہوں نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اور الٹا کانفرنس کی تخریب کے درپے ہو گئے، آج یہ کوئی راز نہیں رہا کہ ان دونوں کے پیچھے یحییٰ خاں کا ہاتھ تھا۔ بہر حال ۲۶ ر فروری کو رسمی گفتگو کے بعد گول میز کانفرنس کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ کیونکہ "مجلسِ عمل" میں شریک جماعتوں کے مابین خاصا اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔

جمعیۃ کا موقف

جمہوری مجلسِ عمل میں شریک جماعتوں کے مابین اختلاف رائے کو دور کرنے کے لئے پہلے تو مشرقی پاکستان کی مجلسِ عمل کا اجلاس ۶ ر سے ۸ ر مارچ تک لاہور میں منعقد ہوا جس میں "جمہوری مجلسِ عمل" کی مرکزی کمیٹی کے لئے پانچ سفارشات منظور کی گئیں۔ (۱) بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات۔ (۲) وفاقی پارلیمانی نظامِ حکومت کا قیام (۳) مکمل صوبائی خود مختاری (۴) آبادی کی بنیاد پر نمائندگی

(۵) وَن یونٹ کا خاتمہ۔ یہ اجلاس مسٹر مشتاق احمد کھنڈکر کی زیر صدارت ہوا

۹ مارچ کو "جمہوری مجلسِ عمل" کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مذکورہ پانچ نکات پر بڑی گرماگرم بحث ہوئی۔ کیونکہ اِن میں آخری تین نکات اُس مشترکہ اعلان کے مطابق نہ تھے جو "جمہوری مجلسِ عمل" کی تاسیس کے وقت جاری کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن کا رویّہ خاص طور پر بڑا سخت تھا۔ وہ اپنے مخصوص مطالبات پر نہایت سختی کے ساتھ اڑ گیا تھا۔

جمعیتہ کی طرف سے اس اجلاس میں مولانا مفتی محمود نمائندگی کر رہے تھے۔ انہوں نے ایجنڈے میں یہ دو مطالبات شامل کرائے۔

۱۔ علماء کے بائیس نکات دستور میں شامل کرائے جائیں تاکہ دستور مکمّل طور پر اسلامی بن سکے۔

۲۔ دستور میں ایک دفعہ شامل کی جائے۔ جس میں مسلمان کی ایسی جامع و مانع تعریف ہو کہ جس کے بعد کوئی غیر مسلم اپنے آپ کو مسلمان کہکر ملک کا سربراہ بننے کے لئے بطور امیدوار کے کھڑا نہ ہو سکے۔[1]

مولانا مفتی محمود نے واضح کیا کہ اگر تو اشتراک کی اُس اساس کو قائم رکھا جاتا ہے۔ جس پر "مجلسِ عمل" کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اور بات صرف ایوب آمریت کے خاتمہ کی گفتگو تک محدود رکھی جاتی ہے۔ اور دوسرے مطالبات نہیں اُٹھائے جاتے۔ تب تو جمعیتہ بھی اس حد تک محدود رہے گی، لیکن اگر آپ اس سے تجاوز کرتے ہیں اور دوسرے مطالبات بھی اٹھاتے ہیں تو پھر سب سے پہلے اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ رکھنا ہوگا۔ یہ جمعیتہ کا بنیادی مطالبہ و مقصود ہے۔ اور جمعیتہ اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ یہ اس ملک کی بڑی بدقسمتی رہی کہ اُس کے سیاستدانوں نے اسلام

---

[1] ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور ۱۸؍ اپریل ۱۹۶۹ء ص ۷

کے ساتھ وفا نہ کی۔ یہ لوگ اپنی مخصوص اغراض کے لئے تو بڑی بڑی تحریکیں چلانے کے اعلان کرتے رہے مگر اسلام کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ چنانچہ ”جمہوری مجلسِ عمل“ کے اجلاس میں بھی یہی ہوا۔ بالآخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ ”جمہوری مجلسِ عمل“ کی طرف سے صرف یہ دو مطالبات پیش کئے جائیں:

۱۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات۔
۲۔ وفاقی پارلیمانی نظامِ حکومت کا قیام۔

کیونکہ انہی دو مقاصد کے حصول کے لئے ”جمہوری مجلسِ عمل“ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ بھی طے پایا کہ ان دو مطالبات کے علاوہ اگر کوئی جماعت چاہے تو انفرادی طور پر اپنے مطالبات پیش کر سکے گی۔

بتکدۂ سیاست میں تکبیر کی صدا

گول میز کانفرنس تمام جماعتوں کے لئے ”دارالامتحان“ بن گئی۔ پوری قوم کی نظریں کانفرنس اور اس کی کارروائی کی طرف تھیں۔ لوگ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کانفرنس میں کون کیا کرتا ہے؟

۱۰ مارچ ۶۹ء کو جب گول میز کانفرنس کافی دنوں کے تعطل کے بعد پھر شروع ہوئی تو ابتدائی تقریر صدر ایوب خاں نے کی۔ ان کے بعد نوابزادہ نصراللہ خاں نے ”جمہوری مجلسِ عمل“ کی طرف سے اُن دو مطالبات کو پیش کیا جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ مولانا مودودی نے فرمایا ”ان دو مطالبات کے علاوہ اگر کوئی جماعت کوئی مطالبہ پیش کرے تو یہ اس کا اپنا نقطۂ نظر ہوگا۔ پوری مجلسِ عمل کا نہ ہوگا“ مولانا کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے فل اسکیپ سائز کے نَو صفحات پر مشتمل تقریر کی اور اپنے چھ نکات کو اٹھایا۔ خان عبدالولی خاں نے وَن یونٹ

توڑنے کی بات کی۔ ائیر مارشل اصغر خاں اور جسٹس محبوب مرشد نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جسٹس صاحب شیخ مجیب کے ہمراز تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے وَن یونٹ توڑنے کے سلسلہ میں خان عبدالولی کی ہمنوائی کی۔ جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے امیر پروفیسر غلام اعظم صاحب نے بھی کچھ مخصوص انفرادی مطالبات اُٹھائے۔ اب کانفرنس کی میز پر یہ سب مطالبات تو تھے، مگر وہ مطالبہ کہیں نہ تھا جس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے اپنا گھر بار لٹایا اور ہزاروں ماؤں بہنوں کی عصمت کے آبگینے پاش پاش ہوگئے۔ ہزاروں سہاگ اُجڑے اور ہزاروں ماؤں کے جوان بیٹے ذبح ہوگئے۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں۔ مولانا مفتی محمود کو جنہوں نے پاکستان کی اس اہم سیاسی و آئینی کانفرنس میں "اسلام زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور اس زور سے لگایا کہ آج پورے ملک میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ ع یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

مولانا مفتی محمود نے اس موقع پر بڑی عمدگی کے ساتھ اسلام کا کیس لڑا۔ انہوں نے نہایت مؤثر تقریر کی اور دستور کی گاڑی کو اسلامی اصولوں کی پٹڑی پر چلانے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اس غرض سے علماء کے وہ مشہور بائیس نکات کانفرنس کی میز پر رکھے جنہیں پاکستان میں موجود تمام مکاتبِ فکر کے جیّد علماء کرام نے جنوری ۵۱ء میں بالاتفاق پیش کیا تھا۔ اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان کا دستور انہی اسلامی اصولوں کی اساس و بنیاد پر وضع کیا جائے۔ مفتی صاحب نے عقیدۂ ختمِ نبوّت کے آئینی تحفظ کی غرض سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ دستور میں مسلمان کی تعریف بھی متعیّن کی جائے۔ "دستور میں جب یہ بات موجود ہے کہ پاکستان کا صدر مسلمان ہوگا تو مسلمان کی تعریف بھی متعیّن ہونی چاہیئے۔"

صدر ایوب خوب سمجھتے تھے کہ مفتی صاحب کے اس مطالبے کی زد کہاں پڑتی

ہے۔ ایم ایم احمد ایسے سکہ بند قادیانی اُن کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے۔ وہ مفتی صاحب کے اس مطالبے سے بھنّا اُٹھے۔

صدر ایوب: "کون نہیں جانتا مسلمان کون ہوتا ہے"؟

مفتی صاحب: "بہت سے لوگ نہیں جانتے اس ملک میں خدا کے منکر ہیں، رسُول کے منکر ہیں، نبوّت کے منکر ہیں، ختمِ نبوّت کے منکر ہیں۔ وہ پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں"۔

صدر ایوب: "کوئی شخص غیر مسلم کو ووٹ نہیں دے گا"۔

مفتی صاحب: "آپ ایسا کریں کہ دستور سے اس دفعہ کو بھی حذف کر دیں (کہ صدر مسلمان ہوگا) کیونکہ اس صورت میں لازمًا مسلمان ہی صدر منتخب ہوگا۔ اس طرح دستور کی یہ شرط بھی لغو ہو جائے گی"۔

گول میز کانفرنس کے شرکاء میں سے صرف جسٹس محبوب مرشد نے اس معاملہ میں مفتی صاحب کی تائید کی اور کہا" اصولاً یہ صحیح ہے تعریف لازمًا متعیّن ہونی چاہیئے"[1] اگرچہ مفتی صاحب کے یہ مطالبات تسلیم نہ کیئے گئے تاہم یہ ضرور آشکارا ہو گیا کہ مفتی محمود پاکستان میں اسلامی سیاسیات کی پیشانی کا جھومر اور نہایت غیر مرعوب قسم کی شخصیت ہیں۔ ۱۳؍ مارچ کو یہ گول میز کانفرنس ختم ہو گئی۔ صدر ایوب نے "جمہوری مجلسِ عمل" کے دو متفقہ مطالبات تسلیم کر لیئے اور باقی مسائل کے بارے میں کہا کہ ان کا حل اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

مارشل لاء کی آمد

گول میز کانفرنس کے پسِ منظر میں جو سرگرمیاں جاری تھیں بالآخر وہ رنگ

---

[1] ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" کراچی کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ۲۴؍ ستمبر ۱۹۶۹ء

لائیں۔ صدر ایوب نے بجائے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے ۲۴ مارچ کو برّی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خاں کو ایک طویل خط لکھا جس کا آغاز "میرے پیارے جنرل یحییٰ" سے ہوتا تھا۔ اور اس کے ذریعہ اقتدار فوج کو سونپ دیا گیا۔

۲۵ مارچ کو ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ یحییٰ خاں نے اس موقع پر جو نشری تقریر کی اُس میں اپنے پیش روؤں اسکندر مرزا اور ایوب خاں کی طرح بڑی چکنی چپڑی باتیں کیں۔ اُس نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ وہ کوئی سیاسی عزائم لیکر نہیں آیا۔ اُس نے کہا۔ "میں یہ بات قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری سوائے اس کے اور کوئی آرزو نہیں ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں، جو ملک میں آئینی حکومت کے قیام کا باعث بن سکیں" اپنے اس نصب العین پر اُس نے عمل درآمد کا آغاز اس طرح کیا کہ آئین منسوخ کر دیا۔ اسمبلیاں توڑ ڈالیں۔ سیاسی سرگرمیاں معطّل کر دیں اور اخبارات پر "سنسر شپ" کا پہرہ بٹھا دیا۔

نواں باب

پاکستان کے پہلے عام انتخابات

الیکشن کی ہماہمی

یحییٰ خاں بہت عیّار انسان تھا۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد نو ماہ تو اُس نے امن و امان کو بحال کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے بہانے گزار دیئے۔ اس دوران اُس نے تمام سیاسی جماعتوں کے اثر و رسوخ کا بغور جائزہ لیا۔ ملک بھر کے سیاسی رہنماؤں سے ملا۔ اور انہیں فیئر الیکشن کی یقین دہانی کرائی اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی تاش میں اپنی مرضی کے پتّے بھی لگاتا رہا۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ تمام سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آ گئی ہیں اور کوئی جماعت بھی پچیس تیس سے زیادہ سیٹیں نہیں جیت سکتی۔ اور اس طرح وہ بدستور صدر رہ سکے گا۔ تو اُس نے یکم جنوری ۷۰ء سے عام انتخابی سرگرمیوں کی اجازت دے دی۔ اگر ایک طرف یہ یحییٰ خاں کے "خلوص" کا امتحان تھا تو دوسری طرف سیاسی جماعتوں کی اسلام دوستی اور حبُّ الوطنی کی آزمائش بھی تھی۔ عوام نے ان

انتخابات میں بہت دلچسپی لی کیونکہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر یہ پاکستان کی تیئس سالہ سیاسی تاریخ میں پہلے عام انتخابات تھے۔

جمعیۃ کا منشور

صدر ایوب کے خلاف ہنگاموں اور احتجاج سے یہ بات بالکل ظاہر ہو کر سامنے آگئی تھی کہ ملک کا اصل مسئلہ عوام کا مسئلہ ہے۔ جنہیں اُن کی منزل (اسلامی پاکستان) سے دور کر کے بدترین اقتصادی اور معاشی مصائب میں مُبتلا کر دیا گیا تھا۔ جمعیۃ کے اکابر نے اس موقع پر حالات کا نہایت دِقّتِ نظری سے مطالعہ کر کے ایک سچّا اسلامی اور عوامی منشور قوم کے سامنے رکھا۔ یہ منشور ۲۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کو کُل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کی "مجلس عمومی" (منعقدہ سرگودھا) میں منظور کیا گیا۔ اس منشور میں جمعیۃ نے نظامِ حکومت، تعلیم، معیشت و اقتصاد، خارجہ امور، دفاع، زراعت، صنعت، صحت، عدلیہ، انتظامیہ اور ٹیکسیشن وغیرہ ایسے اہم امور کے بارے میں اپنی پالیسیوں کی وضاحت کی۔

مولانا مفتی محمود نے جمعیۃ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اس موقع پر ایک یادگار تقریر کی اور ماضی وحال کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور جمعیۃ کی آئندہ پالیسی کے خطوط متعین کئے۔

جمعیۃ کا پہلا اِنتخابی جلسہ

جمعیۃ اپنی پُوری قوت کے ساتھ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ چنانچہ سیاسی سرگرمیوں کی بحالی کے دوسرے روز ۲ جنوری ۷۰ء (جمعۃ المبارک) کو جمعیۃ نے اپنا پہلا انتخابی جلسہ لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ موچی دروازہ میں منعقد

کیا۔ جمعیتہ کی طرف سے انتخابی مہم کا یہ ایک خوشگوار آغاز تھا۔ لاہور کے عوام اور اخبارات میں دنوں تک اس جلسۂ عام کا چرچا رہا۔ مولانا مفتی محمود نے جمعیتہ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اس موقع پہ ایک پُرعزم تقریر کی اور اپنی جماعت کے انتخابی منشور کا اعلان کیا۔ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے مطابق مفتی صاحب نے فرمایا:

> "آج کا یہ جلسۂ عام انتخابی مہم کا ابتدائی اجتماع ہے۔ جمعیتہ علماء اسلام کی طرف سے آج پورے ملک میں اسلامی منشور کا دن منایا جا رہا ہے آج کے روز ہم قوم کے سامنے اپنے منشور کا اعلان کر رہے ہیں۔ جس کی روشنی میں پاکستان کا آنے والا دستور اور پاکستان میں نافذ ہونے والا نظام چلے گا۔ آپ نے کہا کہ ہمیں نو ماہ کے عرصے میں عوام کو سمجھانا ہے اور قوم کے سامنے اس مقصد کو پیش کرنا ہے۔ جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ پاکستان بنے ہوئے بائیس سال گزر چکے ہیں لیکن ہم آج ۱۴؍ اگست کے دن سے پھر ابتدا کر رہے ہیں۔ آپ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بائیس سال کے اس عرصہ میں نہ تو پاکستان کو اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق کوئی دستور مل سکا ہے اور نہ ہی پاکستان میں اسلام کے مطابق قوانین بن سکے ہیں اور نہ ہی اسلامی معاشرہ قائم ہوا اور نہ ہی اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع مہیا کئے گئے ہیں۔ آپ نے کہا کہ جمعیتہ علماء اسلام نے ۵۶ء کے آئین کو غیر اسلامی اور غیر جمہوری قرار دیا تھا۔ ۶۲ء میں ایوب خاں نے ایک نیا آئین قوم کو دیا تھا۔ جو اس پہلے آئین سے بھی زیادہ اقتدار کے تحفظ پر مشتمل تھا۔ آپ نے بتایا کہ صدر مملکت آغا محمد یحییٰ

خان نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور انہوں نے اعلان کیا ہے کہ ۵؍ اکتوبر ۷۰ء میں پاکستان کی پوری قوم ووٹوں سے اسمبلی منتخب کرے گی اور یہ اسمبلی اپنے پہلے اجلاس سے چار ماہ تک نیا آئین قوم کو دے گی۔ آپ نے خبردار کیا کہ اگر اکتوبر ۷۰ء میں منتخب ہونے والی اسمبلی نے ہم پر کسی غیر اسلامی آئین کو مسلط کرنا چاہا تو ہم اس کفر کے خلاف بغاوت کریں گے۔ آپ نے کہا کہ پاکستان میں غیر اسلامی آئین کو قطعاً برداشت نہیں کیا جائے گا۔ پاکستان اسلام کی بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے اس ملک میں اسلام کے سوا کسی دوسرے آئین کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ آپ نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لئے میدان میں نکل آئیں۔ پاکستان کی حفاظت اور نجات اسلام کے بغیر قطعاً ممکن نہیں۔ آپ نے سابق حکمرانوں پر غداری کا الزام عائد کیا اور کہا کہ جن لوگوں کے دامن پر غریبوں کے خون کے دھبے نظر آتے ہیں جن ظالموں کے چہرے غریبوں کے خون سے سُرخ نظر آرہے ہیں۔ وہ قطعاً پاکستان میں غریبوں کی حفاظت کے علمبردار نہیں بن سکتے۔ ان لوگوں نے بائیس سال تک عوام سے کھیل کھیلا یہاں ہم اسلامی طریق پر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، آپ نے اعلان کیا کہ جمعیتہ علماء اسلام قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے گی۔ آپ نے کہا کہ اسلامی حکومت اس بات کی ضامن ہے کہ اس ملک میں کوئی بھی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ پاکستان میں جو لوگ بھوکے رہے ہیں۔ ان کا حساب قیامت والے روز سابق حکمرانوں سے لیا جائے گا۔ آپ نے بتایا کہ اسلام حقیقت میں غریبوں

کا محافظ اور ہمدرد ہے ۔ اسلام حرام اور ظلم کی کبھی اجازت نہیں دیتا ۔ آپ نے کہا کہ دو ماہ قبل پاکستان میں صنعت کاروں اور مزدوروں کا تصادم ہوا ۔ جس کے نتیجے میں مزدور جیلوں میں ہیں ۔ اور صنعت کار جیلوں سے باہر ہیں ۔ میں اس قسم کے تصادم کا قائل نہیں ہوں ۔ لیکن مزدوروں کو بھی ان کا حق دیا جانا ضروری ہے ۔ آپ نے صدرِ پاکستان سے اپیل کی کہ وہ تمام سیاسی قیدیوں اور مزدوروں کو رہا کر دینے کا حکم جاری کریں ۔ مولانا مفتی محمودؒ نے کہا کہ اسلام ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ اسلام میں خرید و فروخت اور کاروبار کے مکمّل اصول موجود ہیں ۔ اسلام حرام طریقوں سے جمع شدہ مال کو رکھنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ آپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں کے پاس حرام طریقوں سے دولت ہے اسلامی نظام قائم ہوتے ہی ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں رہنے دی جائے گی ۔ اگر حلال طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کسی شخص کے پاس ہے تو ان سے ایک پائی بھی نہیں چھینی جائے گی ۔ مولانا مفتی محمود نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے منشور کے مطابق زمین کی ملکیت کا حق اس شخص کو دیا گیا ہے جس نے اُسے اپنی محنت سے آباد کیا ہو ۔ آپ نے مزید کہا کہ ہمیں جو طاقتیں سوشلسٹ کہیں گی ۔ ہم انہیں سامراجی کہیں گے ۔ ان طاقتوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پاکستان بہت جلد سامراجیت سے نجات حاصل کر کے رہے گا ۔ دنیا میں امریکی سامراج کو کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ۔ جو طاقت امریکی سامراج کو بچانے کی کوشش کرے گی خود ہی

دم توڑ دے گی۔ آپ نے کہا کہ سامراجی طاقتیں عالمِ اسلام کے
ستر کروڑ مسلمانوں کی دشمن ہیں۔ ان سے مسلمانوں کا نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔"[1]

جمعیۃ کی اِنتخابی حکمتِ عملی

انتخابی موسم بڑا عجیب ہوتا ہے۔ سیاسی جماعتیں اور اُن کے لیڈر لنگر لنگوٹ کس کر ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلتے ہیں کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔

۷۰ء میں پاکستان کی تئیس سالہ سیاسی تاریخ میں پہلے عام انتخابات ہو رہے تھے۔ کسی جماعت کو بھی اپنی طاقت اور عوامی تائید کا صحیح اندازہ نہ تھا اکثر و بیشتر جماعتوں کے رہنما خوش فہمیوں میں مبتلا نظر آتے تھے۔ اسلامی ذہن کی جماعتیں بجائے آپس میں اتحاد کرنے کے باہم دست و گریبان ہو رہی تھیں۔ اُدھر بیرونی طاقتیں بالخصوص امریکا اس الیکشن میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ پاکستان میں امریکا کے سفیر مسٹر فارلینڈ کی سرگرمیاں ڈھکی چھپی نہ تھیں حالات جماعتی و علاقائی مفاد پر ملکی و قومی مفاد کو اور جوش و غضب پر عقل و تحمّل کو غالب رکھنے کے متقاضی تھے۔ لیکن ہماری جماعتیں اور ہمارے رہنما اِلّا ماشاء اللہ، اس تقاضے سے بے نیاز ہو کر اپنی اپنی انتخابی مہم (ELECTION CAMPAIGN) چلا رہے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ الیکشن اپنے مشہورِ عام چھ نکات کی بنیاد پر لڑا۔ اور ایک مخصوص پسِ منظر کے باعث یہ نکات مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں اُتر گئے۔ مسٹر بھٹو نے یہ الیکشن "روٹی کپڑا اور مکان" کے نعرے پر لڑا۔ ایوب خان کی مخصوص اقتصادی پالیسیوں نیز ۶۵ء کی پاک بھارت

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۳ جنوری ۱۹۷۰ء

جنگ کے بعد جنم لینے والے اقتصادی بحران اور معاشرہ میں موجود شدید معاشی ناہمواری کے خلاف بے پناہ عوامی نفرت کو ذہین بھٹو نے عوام کے چہروں اور مجنونانہ احتجاج سے پڑھ لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی پوری قوّت کے ساتھ اس معاشی مسئلے کو اٹھایا اور اسی کی بنیاد پر انتخاب لڑا۔ علماء اور دینی جماعتوں نے وقت کے تقاضے اور مسٹر بھٹو کی اس سیاسی چال کو نہ سمجھا۔ انہوں نے پیٹ کے مسئلے کو مذہبی مسئلہ بنا کر ”اسلام اور سوشلزم“ کے مابین ”جنگ عظیم“ کا اعلان کر دیا۔ مولانا مفتی محمود اور اُن کی جمعیتہ علماء کا موقف اس ضمن میں خاصا حقیقت پسندانہ رہا۔ انہوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھا اور اس کے مطابق کام کیا۔ وہ ایک طرف ملک میں موجود شدید قسم کی اقتصادی ناہمواری کے خلاف بھی اپنی پوری قوّت سے آواز اٹھاتے رہے۔ دوسری طرف اسلام کے اقتصادی پروگرام کے مقابل الحاد آفریں اشتراکیت اور سوشلزم کا استرداد بھی کرتے رہے۔ مگر انہوں نے سیاسی لڑائی کو ”کفر و اسلام“ کی جنگ قرار دینے سے گریز کیا۔ اُن کا ذہن یہ تھا:

> ”اگر کوئی شخص مارکس اور لینن کے نظریہ کو اسلامی سوشلزم سے تعبیر کرتا ہے تو وہ اسلامی تعلیمات کی تکذیب کرتا ہے اور اگر وہ اسلامی مساوات کے معاشی نظام کو اسلامی سوشلزم کا نام دیتا ہے۔ تو یہ شخص کافر تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ تعبیر کی غلطی کا شکار ضرور ہے۔ کیونکہ اسلام تعبیرات اور اصطلاحات میں بھی خود کفیل ہے اور وہ کسی غیر ملکی اصطلاح کا محتاج نہیں“[1]

---

[1] روزنامہ ”مشرق“ لاہور مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ۱۵ ر مارچ ۱۹۷۰ء

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملک میں موجود مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا۔ مولانا مفتی محمود اس ضمن میں اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”جمعیتہ نے اسے ناکافی سمجھا کہ بعض وقتی اعلانات کے ذریعہ عوام سے کہہ دیا جائے کہ یہ ہمارا معاشی و اقتصادی منشور ہے، اس سے ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بلکہ جمعیتہ نے براہِ راست مسلمان عوام، کسانوں اور مزدوروں وغیرہ سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا۔ وہ تنظیمیں جو ایک مدت سے مزدوروں و کسانوں میں کام کر رہی تھیں اور گذشتہ ۲۲ سال کی اسلام کش و سرمایہ دارانہ پالیسی سے بیزار و مایوس ہو کر دوسرے ذرائع و نظاموں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جمعیتہ نے اُن کو دعوت دی کہ آؤ اپنے مطالبات کو اسلام کی روشنی و رہنمائی میں مرتب کرو اور ان کے حصول کے لئے کوشاں ہوؤ، جمعیتہ اس سلسلہ میں تمہارے ساتھ معاونت کرے گی۔“[1]

جمعیتہ کی یہ آواز رائیگاں نہ گئی اور کسانوں و مزدوروں کی وہ تنظیمیں جنہیں یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ سوشلزم ہی ان کے مسائل کا واحد چارۂ کار ہے اور جسے کم و بیش ملک کی ہر جماعت نے اپنے سابقہ منشوروں میں شامل کیا ہوا تھا، جمعیتہ کی اس دعوت پر اسلام کی معاشی و اقتصادی ہدایات کی طرف متوجہ ہوئیں۔

اسی دوران میں مفتی صاحب اور اُن کی جماعت کا مزدوروں کی ایک مضبوط

---

[1] مولانا مفتی محمود کی جمعیتہ کی ”مجلسِ عمومی“ اور ”مجلسِ شوریٰ“ پر مشتمل اجلاس میں تقریر ۲۶ ستمبر ۱۹۶۹ء، ہفت روزہ ”ترجمانِ اسلام“ لاہور - ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۴۔

تنظیم "لیبر پارٹی" سے معاہدہ ہوا۔ کیونکہ اس تنظیم نے جمعیتہ علماء کے منشور (MANIFESTO) کو من و عن قبول کر لیا تھا۔ اور اس کے نفاذ میں اپنے مکمّل تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اس معاہدے پر اگرچہ دیگر دینی جماعتوں نے نہایت شدید اعتراضات کیئے اور کہا کہ مفتی صاحب اور اُن کی جماعت "سوشلسٹ" ہوگئی ہے۔ مگر امرِ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب اس معاہدے کے ذریعے مزدوروں اور محنت کشوں میں یہ تاثر پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب رہے کہ اسلام ان کا دشمن نہیں۔ بلکہ اُن کے حقوق کا سچّا محافظ ہے،

مفتی صاحب اور اُن کی جمعیتہ نے اپنے منشور کی بنیاد پر دیگر جماعتوں کو بھی اشتراکِ عمل کی دعوت دی۔ مفتی صاحب نے صاف لفظوں میں کہا کہ "اسلامی نظامِ حیات برپا کرنے کے لئے اتحادِ اسلامی کا قیام ایک بڑی اور اہم ضرورت ہے۔۔۔۔۔ جمعیتہ کی خواہش ہے کہ بلا لحاظ دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، سُنّی، شیعہ وغیرہ اسلامی نظامِ حیات برپا کرنے کے خواہاں عناصر اس مقصد کے حصول کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں[1]" مگر مخصوص حالات و وجوہ کے باعث یہ دعوت پروان نہ چڑھ سکی۔ چنانچہ جمعیتہ نے یہ الیکشن تنہا ہی لڑا۔۔۔۔۔ اور اپنی تمام تر مفلسی اور بے سروسامانی کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ خوب لڑا۔

حیران کُن اِنتخابی نتائج

۷ر دسمبر ۷۰ء کو ملک بھر میں پولنگ ہوئی جس کے حیران کُن نتائج سامنے آئے۔ مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ، پنجاب اور سندھ سے پیپلز پارٹی اور سرحد و بلوچستان سے نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیتہ علماء اسلام اُبھر کر سامنے آئیں۔ مؤخر الذکر دونوں جماعتوں نے آگے چل کر آپس میں اتحاد کر لیا۔ مشرقی پاکستان میں الیکشن کا نتیجہ

محیر العقول تھا۔ سوائے مسٹر نور الامین مرحوم (جمہوری پارٹی) اور راجہ تری دیو رائے (چکمہ چیف) تمام نشستیں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے جیت لیں گویا مشرقی پاکستان کی ہر جماعت پر جھاڑو پھر گئی۔ وہ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی ہو کر نہیں بلکہ واحد نمائندہ ہو کر آئے۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے بعد باعتبار مجموعی سب سے زیادہ ووٹ مفتی محمود صاحب کی جمعیتہ علماء اسلام نے حاصل کئے[1]۔ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت حاصل کی۔ جبکہ بلوچستان کی چار نشستوں میں سے پیپلز پارٹی کو ایک نشست بھی نہ ملی۔ صوبہ سرحد کی قبائل سمیت ۲۵ نشستوں سے پیپلز پارٹی کو صرف ایک نشست حاصل ہوئی۔

سیٹوں کے اعتبار سے متذکرہ بالا جماعتوں کی پارٹی پوزیشن اس طرح قائم ہوئی:

۱۔ عوامی لیگ	۱۵۱
۲۔ پیپلز پارٹی	۸۱
۳۔ جمعیتہ علماء اسلام	۷
۴۔ نیپ	۶

مفتی محمود۔ فاتح بھٹو

انتخابی سیاست کا میدان جنگ کے میدان سے کم نہیں ہوتا اور جب دو بڑے حریف آپس میں ٹکرا جائیں تو مقابلہ قیامت کا ہو جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمود نے یہ الیکشن اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے لڑا، ایوب خاں کے زمانہ میں اپنا پہلا الیکشن بھی انہوں نے یہیں سے لڑا اور جیتا تھا۔ ۷۰ء میں

---

[1] روزنامہ "حریت" کراچی کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ۱۵؍ مئی ۱۹۷۲ء

اس سیٹ پر زبردست معرکہ ہوا۔ مفتی صاحب کے حریف پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور سابق وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ جو مغربی پاکستان میں پانچ جگہ سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ مولانا مفتی محمود کے سیاسی مخالفین جو انہیں "پرو بھٹو" (PRO - BHUTTO) قرار دیتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ وہ اس مقابلے پر بہت حیران ہوئے۔ بہرحال مقابلہ ہوا اور خوب ہوا اور وہ ذوالفقار علی بھٹو جنہوں نے لاہور میں علامہ اقبالؒ کے فرزند جناب جاوید اقبال (حال جسٹس پنجاب ہائی کورٹ) کو شکست دی۔ انہیں ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سیٹ پر فقیر غیور (مولانا مفتی محمود) کے مقابل تیرہ ہزار ووٹوں سے ہزیمت اٹھانا پڑی۔ پورے ملک میں یہ واحد سیٹ تھی جہاں مسٹر بھٹو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک بھر میں یہ خبر نہایت حیرت و مسرت سے سُنی گئی۔ اخبارات میں اس کا خُوب خوب چرچا ہوا۔ یحییٰ خاں نے کہا "ملک میں اسلامی آئین کے نفاذ کے لئے مفتی صاحب کی کامیابی ضروری تھی"، شیخ مجیب الرحمٰن نے پیغام بھیجا، "آپ کی کامیابی سے اسلام کو تقویت پہنچے گی" سب سے دلچسپ تبصرہ خود جناب بھٹو کا تھا، انہوں نے کہا "مَیں آئندہ کبھی مفتی محمود صاحب کے مقابلے میں الیکشن نہیں لڑوں گا"

مفتی صاحب کا انتخابی معرکہ اس اعتبار سے بھی نہایت اہم تھا کہ وہاں امریکا کے سفیر مسٹر فارلینڈ نے گہری دلچسپی لی۔ وہ یہ جاننے کے انتہائی آرزومند رہے کہ مولانا مفتی محمود کے اثرات اس علاقہ میں کس قدر ہیں؟ اس سلسلہ میں وہ خود بھی بہ نفسِ نفیس ایک خفیہ مشن پر ڈیرہ اسمٰعیل خاں گئے[1] لیکن قدرت نے اُن کی تمام پُراسرار سرگرمیوں کو ناکام بنا دیا۔ اور مفتی صاحب

ہزار دام سے نکلا ہُوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

---

[1] "مفتی محمود کی سیاست" ص ۱۸۲ از قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ

کے مصداق بھرپور اکثریت سے انتخاب جیت گئے ۔

بہرحال انتخابات نے جہاں اور بہت سے سیاسی حقائق منکشف کئے وہاں یہ حقیقت بھی ابھر کر سامنے آئی ۔ کہ مولانا مفتی محمود اور اُن کی جمعیتہ علماء اسلام آگے چل کر ملک کی سیاست میں اہم کردار ادا کرے گی ۔

دسواں باب

آئینِ شریعت کانفرنس لاہور

وقت گزر جاتا اور یادیں رہ جاتی ہیں۔ ۷۰ء میں سیاسی سرگرمیاں بحال ہونے پر ملک بھر میں جلسوں اور جلوسوں کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔

۷۰ء کے وسط تک اہلِ لاہور نے گوناگوں قسم کے جلسوں اور جلوسوں کا تماشا کیا۔ اس دوران میں جمعیتہ علمائِ اسلام نے بھی "آئینِ شریعت کانفرنس"، کے نام سے ایک تاریخی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ جو ۲۶؍ سے ۲۸؍ جون تک جاری رہی یہ سہ روزہ کانفرنس دہلی دروازہ میں منعقد ہوئی۔ جس کے ایک اجلاس کی صدارت لیبیا کے عزت مآب سفیر جناب العفتنغی نے کی۔ اس کانفرنس کو ہم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے جمعیتہ کی عملی جدّ و جُہد کا دوسرا سنگِ میل قرار دے سکتے ہیں۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لئے اندرونِ پنجاب کے علاوہ سرحد، سندھ اور بلوچستان تک سے لوگ آئے اور اس جذبے کے ساتھ آئے کہ "ہمارے پاس خون ہے مفتی محمود کو اختیار ہے جہاں چاہیں گرادیں۔ اسلامی آئین کے لئے جہاد کرنے کو تیار ہیں[1]"، شاہی مسجد کے میناروں نے اُس دن تک بہت سے کاروان

---

[1] لورالائی صوبہ بلوچستان کے امیرِ جمعیتہ مولانا غلام حیدر کی "آئینِ شریعت کانفرنس" کے دوسرے اجلاس میں تقریر۔ اس اجلاس میں کم و بیش تین لاکھ افراد شریک تھے۔

دیکھے ہوں گے۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ۲۶ جون کو لاہور کی حدود میں داخل ہونے والا یہ کاروان اپنی مثال آپ تھا۔ جب آئینِ شریعت کا مطالبہ کرنے والے عظیم قافلے چاروں طرف سے لاہور میں داخل ہوئے تو اہل لاہور دنگ رہ گئے۔ اور لاہور اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود سکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

۲۶ جون کو ایک عظیم الشان جلوس کا اہتمام تھا۔ جس کو امیر جمعیۃ، حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی مدظلہ، نے جنہیں قرنِ اوّل کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان ایمان افروز کلمات کے ساتھ روانہ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہو۔ قبائل اور برادریوں کا سلسلہ محض باہمی تعارف کے لئے ہے۔ نہ اس لئے کہ تم لوگ ان چیزوں کے بت بنا کر پوجنا شروع کر دو اور برادریوں کے بل بوتے پر کسی کو حقیر و ذلیل سمجھو۔ عزت و ذلت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور خدا کے نزدیک وہی صاحب عزت ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے [1]"

انہوں نے اپنی جماعت کے کارکنوں اور شرکاءِ جلوس سے یہ حلف لینے کے بعد کہ وہ دورانِ جلوس کوئی خلافِ شریعت حرکت نہ کریں گے اور نہ ہی ایسا کوئی نعرہ لگائیں گے۔ جلوس کو روانگی کی اجازت دی۔ وہ عجب روح پرور منظر تھا۔ ہر طرف علَمِ نبویؐ کے اتباع میں سفید اور سیاہ دھاریوں والے پرچم لہرا رہے تھے۔ ہزاروں بینرز اٹھائے ایک دنیا ساتھ چل رہی تھی۔ اور دل کی تحریروں نے کتبوں پر اس طرح جگہ بنا لی تھی۔ "ہمارے مسائل کا واحد حل اسلامی آئین ہے"

---

[1] ماہنامہ "تبصرہ" لاہور کا "آئینِ شریعت کانفرنس نمبر" اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۰

"ملک کی نجات اسلامی نظام کے نفاذ میں ہے۔" "ختمِ نبوت کا تحفظ کرو" "ہم سرمایہ داری اور اشتراکیت سے بیزار ہیں" "غریبوں اور مزدوروں کے مسائل کا حل صرف اسلامی نظام ہی ہے۔" "امریکی سامراجیو! ایشیا سے نکل جاؤ" "عربوں کی حمایت ہمارا فرض ہے" "جمعیۃ علماء اسلام کا مقصد اسلامی آئین کا نفاذ ہے۔"

۲۷ جون کے اجلاس کی صدارت لیبیا کے سفیر جناب الغفنفی نے کی۔ جہاں تھوڑے ہی دن پہلے مغربی استعمار کے آلۂ کار شاہ ادریس السنوسی کو دیس نکالا دے کر آتش بجان قذافی نے اقتدار سنبھالا تھا۔ اس اجلاس میں ایک دنیا تھی جو اُمنڈ آئی تھی۔ جناب الغفنفی جن کا چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اور خوشی و مسرت کی لہریں جن کے بشرے پر اُچھل اچھل پڑ رہی تھیں۔ انہوں نے اس موقع پر عربی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں خود کو آپ جیسے عزیزوں کے درمیان پاکر بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ آپ ہمارے ہر غم اور خوشی کے مخلص رفیق ہیں۔ مجھے آپ سے ملنے کا انتہائی شوق تھا۔ الحمدللہ! آج اس شوق کی تکمیل ہوئی۔"

"آپ اس دور میں اسلامی علوم و ثقافت اور اسلامی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ عہدِ حاضر کی تاریکیوں میں ہماری راہوں کو روشن رکھنے والے آپ ہیں۔ آپ نئی نسل کی تربیت کر رہے ہیں۔ جو دین و دنیا سے باخبر ہو کر مستقبل کی امین بننے والی ہے، آپ کی دور اندیش اور حقیقت بین جماعت حق و انصاف اور آزادی و ترقی کی حامی رہی ہے اور ہمیں آپ کے اس بلند اور بے داغ مؤقف پر فخر ہے۔ عرب سرزمین پر اسرائیل کے قبضہ اور سامراج کی ریشہ دوانیوں کے خلاف آپ کی مساعیِ جمیلہ اور اعلانِ حق نے ہمیں آپ کا

گرویدہ بنا دیا ہے"۔

جناب الغضنفی کی اس پرخلوص تقریر کا جواب مولانا مفتی محمود نے نہایت فصیح عربی میں دیا۔ اُس روز مفتی صاحب عجمی سے کہیں زیادہ عربی لگ رہے تھے۔ مفتی صاحب کی تقریر عربی دانی کا نہایت خوبصورت نمونہ تھی۔ جس نے مجمع کو تصویرِ حیرت و مسرت بنا دیا تھا۔ مفتی صاحب نے سفیر موصوف سے مخاطب ہو کر کہا:

"ہمیں آپ کی تشریف آوری پر جو مسرت حاصل ہوئی ہے اُس کے اظہار کے لئے میں بڑے سے بڑے لفظ کو بھی ناکافی پا رہا ہوں۔ اور دل کی گہرائیوں سے آپ کی تشریف آوری کا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

عربوں کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے مفتی صاحب جذبات کی معراج پر تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اخوّتِ اسلامی کی پُرجوش لہریں ایک دوسرے سے اُٹھ اُٹھ کر لپٹنے لگی ہوں۔

"عرب بھائیوں کے لئے ہمارے برادرانہ جذبات کی سرشاری الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ہم ان کے لئے دل کا ہر گوشہ وا کئے ہوئے ہیں۔ ان کے مصائب ہمارے مصائب ہیں اور ان کے خلاف استعمار کا ظلم و ستم اور ریشہ دوانیاں ہمارے خلاف ظلم و ستم ہے"

"ہم تہیّہ کر چکے ہیں کہ عرب سرزمین کو استعمار کے ناپاک وجود سے اور فلسطین و بیت المقدس کو یہودیوں کے نجس اثرات سے پاک کرنے کی ہر جدوجہد میں عرب ملکوں اور عرب عوام کا آخر وقت تک ساتھ دیں گے۔ استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ ہماری ہمدردیاں غیر مشروط اور دائمی ہیں۔"[1]

مولانا مفتی محمود نے اس موقع پر ایک تاریخی خطبہ دیا۔ جس میں اپنی

---

[1] ماہنامہ "تبصرہ" لاہور کا "آئینِ شریعت کانفرنس نمبر" اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۰

جماعت کی تاریخ، اس کے نصب العین اور سیاسی پالیسیوں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔

اس کانفرنس کی ایک یاد مولانا کوثر نیازی سے وابستہ ہے جو آج مفتی صاحب کو بیرونی طاقتوں کا ایجنٹ قرار دیتے نہیں تھکتے۔ انہوں نے جمعیتہ کے کارکنوں سے مخاطب ہو کر کہا ”آپ خوش قسمت ہیں۔ آپ اس قافلے سے تعلق رکھتے ہیں جو بدر و احد سے چلتا ہوا میدانِ کربلا اور پھر بالاکوٹ پہنچا۔ آپ کے سالارِ قافلہ حضرت درخواستی ہیں جن کی بات اللہ تعالیٰ کے حضور یقیناً بہت بڑا درجہ رکھتی ہے، آپ لوگ مفتی محمود کی رکاب تھامے ہوئے ہیں جس نے اپنے فتوے کی قیمت کبھی وصول نہیں کی بلکہ وہ محمود بن کر سامراج کے سومنات کو پاش پاش کر رہا ہے“[1]

---

[1] ماہنامہ ”تبصرہ“ لاہور اگست ۱۹۷۰ء ص ۱۵

گیارہواں باب

سقوطِ مشرقی پاکستان

بحران کا آغاز

انتخابات کے قطعی غیر متوقع نتائج نے یحییٰ خان کی تمام خواہشات اور اندازوں کے محل چکنا چور کر کے رکھ دیئے۔ اس کے قریبی حلقوں کے مطابق ان دنوں اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان کی سیاسی و نفسیاتی فضا اُسی قدر پُرسکون اور خوشگوار ہو گئی تھی۔

شیخ مجیب نے ۳۰۰ کے ہاؤس میں ۱۵۱ نشستیں حاصل کی تھیں۔ سیلاب کے باعث ۹ نشستوں پر انتخاب ہونا تھا۔ مگر ظاہر ہے وہ سیٹیں بھی شیخ مجیب ہی کی تھیں۔ بنگالیوں کی خوشی قابلِ فہم تھی۔ کیونکہ سیاست کا مرکز نہایت فیصلہ کُن انداز میں ڈھاکا منتقل ہو گیا تھا۔ اور اب وہ سیاسی اقتدار کے بلا شرکتِ غیرے مالک تھے۔ اصولی طور پر چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ فوراً اسمبلی کا اجلاس بلایا جاتا، دستور سازی کا کام ہوتا اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیا جاتا۔ لیکن

ہوا یہ کہ انتخابی نتائج کو ایک ماہ سے زائد عرصہ گذر جانے کے باوجود یحییٰ خاں نے اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ کا کوئی اعلان نہ کیا۔ اس دوران مسٹر بھٹو نے افسوس ناک بیان بازی شروع کر دی۔ ۲۳؍ دسمبر ۷۰ء کو لاہور میں کہا ”مرکزی حکومت میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی اکثریتی جماعتوں یعنی پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کا مساوی حصہ ہونا چاہیئے“ اس پر بس نہ کیا بلکہ یہ بھی فرمایا ”اور ہوگا“ مزید یہ ارشاد ہوا ”میں اور صدر یحییٰ اور شیخ مجیب اگر متحد ہو جائیں تو پھر دستور آسانی سے بن سکتا ہے[1]“ ظاہر ہے مسٹر بھٹو اس قسم کی باتیں کس کے ایماء پر کر رہے تھے۔ اِدھر بھٹو صاحب نے یہ ”مشن“ شروع کیا۔ اُدھر مولانا بھاشانی نے علیحدہ دارالحکومت اور علیحدہ آئین کا دادرا چھیڑ دیا۔ ۲۹؍ دسمبر ۷۰ء کو مسٹر بھٹو نے یحییٰ خاں سے کراچی میں ملاقات کی۔ اور اخبار نویسوں کو یہ تاثر دیا کہ ”صدر سے میری ملاقات انتہائی مفید اور تعمیری رہی ..... میں نے زور دے کر صدر سے یہ بات کہی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مفاہمت کے بغیر آئین کی تدوین ممکن نہیں[2]“

شیخ مجیب نے اس صورتِ حال کا نہایت سختی سے نوٹس لیا۔ انہوں نے کہا ”میں واضح طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم کسی شخص یا گروہ کو ملک کے کسی حصے کا اجارہ دار نہیں سمجھتے۔ ہمیں عوام کی اکثریت نے دستور سازی اور ملک کے تمام حصوں میں بسنے والے عوام کے مسائل کو حل کرنے کا حق سپرد کر رکھا ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتی[3]“۔ شیخ مجیب کا بیان ”طوفان زیرِ آب“ کا پتہ دے رہا تھا۔ یحییٰ خاں کے تاخیری حربوں اور مسٹر بھٹو کی بیان بازی نے مشرقی پاکستان کے عوام کو برہم کر دیا۔ یہ اضطرابی و طوفانی کیفیت پیدا کر کے

---

[1] روزنامہ ”جنگ“ کراچی ۲۴؍ دسمبر ۱۹۷۰ء

[2] روزنامہ ”جنگ“ کراچی ۳۰؍ دسمبر ۱۹۷۰ء

[3] روزنامہ ”امروز“ لاہور ۱۱؍ جنوری ۱۹۷۱ء

وسط جنوری ۷۱ء میں یحییٰ خاں مشرقی پاکستان گئے۔ اور شیخ مجیب سے مذاکرات کے بعد ۱۴؍ جنوری کو ڈھاکا ہی میں اُن کے وزیرِ اعظم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور یہ دعوٰی بھی کیا کہ اسمبلی کا اجلاس اگلے ماہ (فروری) کے وسط تک ضرور بلا لیا جائے گا۔ مشرقی پاکستان سے واپسی پر یحییٰ خاں اپنے لاؤ لشکر سمیت لاڑکانہ گئے اور ۱۷؍ جنوری کو بھٹو صاحب کے ساتھ "مذاکرات" کئے۔ ان "مذاکرات" کے بعد پیپلز پارٹی نے اپنی پوری قوّت کے ساتھ عوامی لیگ کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ادھر سرکاری ذرائع ابلاغ نے چھ نکات کے خلاف آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

عوامی لیگ کی خواہش تھی اسمبلی کا اجلاس جلد ہو۔ یحییٰ خاں اور مسٹر بھٹو یہ چاہتے تھے کہ پہلے "معاملہ" طے ہو پھر اسمبلی کا اجلاس ہو۔ آخر جب عوامی لیگ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ تو شیخ مجیب نے نہایت شدّت کے ساتھ اجلاس بلانے کا سوال اُٹھایا۔ انہوں نے کہا ۱۵؍ فروری کو قومی اسمبلی کا اجلاس ہونا چاہیئے۔ مسٹر بھٹو نے گرہ لگائی ہمیں یہ تاریخ منظور نہیں۔ اسمبلی کا اجلاس مارچ کے پہلے ہفتے میں بلایا جائے۔

جنرل یحییٰ نے بھٹو کا "مطالبہ" تسلیم کیا۔ اور ۱۴؍ فروری کو یعنی انتخابات کے سوا دو ماہ بعد اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۳؍ مارچ کو ڈھاکا میں ہو گا۔ فی الحقیقت یہ عوامی لیگ کو بھڑکانے والی بات تھی۔ مگر شیخ مجیب نے اسے کوئی مسئلہ نہ بنایا۔ اور غیر مشروط طور پر ۳؍ مارچ کے اجلاس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

اس دوران مسٹر بھٹو اور یحییٰ خاں نے مغربی پاکستان کی دیگر اقلیتیں پارلیمانی پارٹیوں کو اپنے ساتھ ملانے کی سر توڑ کوشش کی۔ خان عبدالولی خاں اور مولانا مفتی محمود پر خصوصی توجہ مبذول کی گئی۔

مفتی صاحب کا مَوقِف

۱۲ر فروری کو مسٹر بھٹو پشاور پہنچے ۔ مولانا مفتی محمود سے ملاقات کی ۔ اس ملاقات میں مسٹر بھٹو نے مفتی صاحب کو شیخ مجیب کے " عزائم " سے خبردار کیا ۔ اور تجویز پیش کی کہ " مغربی پاکستان کی تمام منتخب جماعتوں کو اس حصے کے تحفظ کے پیشِ نظر متحدہ اقدام کرنا چاہیئے ۔ اور ایک ہی آواز اٹھانی چاہیئے تاکہ شیخ مجیب کو " ٹھیک " کیا جا سکے ۔" مسٹر بھٹو نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ " ہمیں قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس کا بائیکاٹ کر دینا چاہیئے تاکہ مجیب اپنی مرضی کا آئین ہم پر مسلط نہ کر سکے ۔" مولانا مفتی محمود بیان کرتے ہیں کہ " ہم نے جواب دیا کہ چونکہ عام انتخابات کے کافی عرصہ بعد قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جا رہا ہے ۔ اس لئے اب اسے ملتوی نہیں ہونا چاہیئے ۔ نیز مشرقی پاکستان والے پہلے ہی شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں کہ انہیں اکثریت حاصل کرنے کے باوجود حکومت سازی کی دعوت نہیں دی جا رہی اور اسمبلی کے اجلاس میں پہلے ہی غیر معمولی تاخیر ہو چکی ہے ۔

اس لئے اب اجلاس بلا کر ملتوی کرنا خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے ۔ باقی رہا شیخ مجیب کا چھ نکات کی بنیاد پر آئین مسلط کرنا تو ہم سب مغربی پاکستان کے مفادات کا تحفظ کریں گے ۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر جائیں گے ۔"[1]

جب مسٹر بھٹو کو اپنے " مشن " میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے پشاور ہی میں مجوزہ اجلاس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ۔ مفتی صاحب نے اس کے جواب میں ڈھاکا اجلاس میں شرکت کا اعلان کیا ۔ ۱۷ر فروری کو ملتان میں ایک پریس کانفرنس

---

[1] حمود الرحمٰن کمیشن کے رُوبرُو مولانا مفتی محمودؒ کا بیان

سے خطاب کرتے ہوئے مفتی صاحب نے متنبہ کیا کہ "قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہ کی گئی تو ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی" انہوں نے کہا کہ تمام جماعتوں کو ڈھاکا کا اجلاس میں شرکت کرنی چاہیئے۔ انہوں نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے بتایا "ہم مغربی پاکستان کے مفادات کا پورا تحفظ کریں گے۔ اگر ہم اس میں ناکام ہو گئے تو اسمبلی کی باقی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے"[1] ۱۹؍ فروری کو لاہور میں مفتی صاحب نے مسٹر بھٹو کے موقف پر کڑی تنقید کی اور کہا:

"قومی اسمبلی کے بائیکاٹ سے ملک تقسیم ہو گیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری بھٹو پر عائد ہو گی" "آئین سازی کے معاملہ میں دوسری جماعتوں کے ۵۶ ارکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فوج کو سیاسی فریق قرار دے کر بھٹو نے سخت ناانصافی کی ہے" درپیش مسائل کے بارے میں کہا "متنازعہ آئینی مسائل قومی اسمبلی کے اجلاس میں طے کئے جائیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کے منتخب ارکان کو اجلاس میں شرکت کرنا چاہیئے۔" انہوں نے اعلان کیا "مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر کے راہِ فرار اختیار کی ہے لیکن ہم ملک کے اجتماعی مفاد کے لئے آخر دم تک اسمبلی کے اندر جنگ جاری رکھیں گے"[2]

یحییٰ خاں کو دو ٹوک جواب

جو کام مسٹر بھٹو باہر کر رہے تھے وہی جنرل یحییٰ اندرونِ خانہ کر رہے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مفتی صاحب مسٹر بھٹو کی کوئی بات مان کر نہیں دے

---

[1] روزنامہ "مشرق" لاہور ۱۸؍ فروری ۱۹۷۱ء

[2] روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۰؍ فروری ۱۹۷۱ء

رہے بلکہ اُلٹا دوسری جماعتوں کو بھی شرکت کے لئے "اُکسا" رہے ہیں۔ تو اُس نے ۲۰ فروری کو یعنی لاہور والے بیان سے اگلے روز مفتی صاحب اور مولانا ہزاروی کو اپنے ہاں بُلا لیا۔ یحییٰ خان نے مفتی صاحب پر زور دیا کہ "وہ ۳ مارچ کو ہونے والے اجلاس میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کر دیں کیونکہ وہ اسے ملتوی کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔" مفتی صاحب نے یحییٰ خاں کو سمجھایا کہ وہ عقل کے ناخن لے۔ یہ فیصلہ انجام کار ملک کو لے ڈوبے گا۔ "اگر آپ اجلاس ملتوی کرنا چاہتے ہیں، تو کر دیں ہم التواء اور اس کے بعد نتائج کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہیں" یحییٰ خان نے کہا۔

"اگر آپ لوگ اجلاس میں نہ جانے کا اعلان کر دیں تو مجھے اجلاس ملتوی کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ نیز اسمبلی کے اجلاس سے پہلے آئینی مسائل پر مفاہمت ضروری ہے۔ کیونکہ اجلاس بلانے کی صورت میں ایک سو بیس دن کی مقررہ میعاد کے اندر آئین سازی کا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا تو اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان کرنا ہوگا۔ جس سے خزانۂ سرکار پر نو کروڑ روپے کا بوجھ آن پڑے گا۔ علاوہ ازیں اگر آئین مجیب کے چھ نکات کے مطابق بن گیا۔ تو اس سے ملک ٹوٹ جائے گا۔"

مفتی صاحب نے یحییٰ خاں سے اختلاف کرتے ہوئے کہا

"بالفرض شیخ مجیب نے اسمبلی کے اندر ہماری بات نہ مانی اور چھ پوائنٹ پر اصرار کر کے آئین بنا لیا تو ہمارے خیال کے مطابق ملک ٹوٹنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ لیکن اگر ۳ مارچ کا بلایا ہوا اجلاس ملتوی کر دیا گیا تو یہ ملک اسی سال دو ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔" مفتی صاحب نے یحییٰ خاں سے یہ بھی کہا۔

„جب آپ کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ شیخ مجیب اور مسٹر بھٹو میں باہمی مناقشت کی وجہ سے آئین ایک سو بیس دن کی مدت کے اندر نہیں بن سکے گا۔ تو آپ مقررہ میعاد کے اندر توسیع بھی تو کر سکتے ہیں۔ اس سے وہ خطرہ ٹل جائے گا جس کے تحت آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اسمبلی ٹوٹ جائے گی اور دوبارہ انتخابات کرانے پڑیں گے۔ اس لئے یا تو میعاد والی شرط ختم کر دیں یا اس میں توسیع کر دیں لیکن قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہ کریں" مگر یحییٰ خان کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔

اس ملاقات میں مفتی صاحب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ یحییٰ خان صبر سے کام لیں، وہ مجیب سے بات کرتے ہیں۔[1]

مفتی محمود ڈھاکہ میں

مولانا مفتی محمود اپنے رفیق مولانا غلام غوث ہزاروی کے ساتھ شیخ مجیب سے مفاہمت کی گفتگو کے لئے ۲۰ فروری کی شام کو کراچی پہنچے۔ ہوائی اڈے پر میر رسول بخش تالپور اور مولانا کوثر نیازی موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مسٹر بھٹو آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مفتی صاحب وہاں سے مسٹر بھٹو کے ہاں چلے گئے۔ مسٹر بھٹو نے مفتی صاحب کو دوبارہ ۳ مارچ کے اسمبلی اجلاس میں شرکت نہ کرنے پر آمادہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ حتیٰ کہ مفتی صاحب کی داڑھی پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ "صرف آپ اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیں، باقی سب کو ٹھیک کر لوں گا۔"

بھلا مفتی صاحب پر ان حربوں کا اثر کیا ہونا ہے۔ یہ دھن کا پکا اور قول کا سچا

---

[1] یہ تمام تفصیل مفتی محمود صاحب کے اس بیان کی مدد سے درج کی گئی ہے۔ جو انہوں نے حمود الرحمٰن کمیشن کے روبرو دیا تھا۔

انسان ۲۱ فروری کی صبح کو کلمبو کے راستے ڈھاکا جا پہنچا۔
مفتی صاحب نے دھان منڈی میں واقع شیخ مجیب کی قیام گاہ پر دو گھنٹے تک اُن سے بات چیت کی۔ یہ پہلے مغربی پاکستانی پارلیمانی لیڈر تھے جنہوں نے ڈھاکا جا کر شیخ مجیب سے ملاقات کی۔ شیخ مجیب نے مفتی صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ایک اور صرف ایک پاکستان چاہتا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ چھ نکات سے ملک دو ٹکڑے نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود اگر کوئی اندیشہ ہو تو میں مغربی پاکستان کے لیڈروں سے ان نکات پر بات چیت کے لئے تیار رہوں۔ اس ملاقات کے بعد مفتی صاحب نے ڈھاکا میں جو بیان دیا۔ اُسے پی پی آئی (پاکستان پریس انٹرنیشنل) نے یوں رپورٹ کیا:

”عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کی یہ زبردست خواہش ہے کہ پاکستان متحد اور مضبوط رہے۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ کہ چھ نکات پر مبنی آئین سے پاکستان کی سالمیت کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔“[1]

۲۴ فروری کو خود شیخ مجیب الرحمٰن نے اعلان کیا کہ ”عوامی لیگ مغربی پاکستان پر چھ نکات نہیں ٹھونسے گی اور اگر یونٹوں کی یہی خواہش ہو تو وفاقی حکومت کو اضافی اختیارات تفویض کئے جا سکتے ہیں۔“[2]

تہہ منظر

آج یہ راز کوئی راز نہیں رہا کہ جب مفتی صاحب نہایت جگرداری اور دلسوزی کے ساتھ اجلاس کے حق میں آواز اٹھا رہے تھے۔ تب مشرقی پاکستان کے گورنر اور

---

[1] روزنامہ ”امروز“ لاہور ۲۲ فروری ۱۹۷۱ء

[2]

مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی اندرونی طور پر یحییٰ خاں کو یہی مشورہ دے رہے تھے۔ وہ نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ یحییٰ خاں کو تمام صورتِ حال بتاتے رہے۔ انہوں نے بار بار کہا کہ ملک و قوم کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ اقتدار جلد از جلد عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ "جب اسمبلی کے ایوان میں بحث ہوگی تو بیشتر اختلافات دُور ہو جائیں گے"[۱] اور جب ایڈمرل احسن (گورنر) اور لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ محمد یعقوب (جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف) کو صدر کے التواء کے فیصلے کا علم ہوا تو انہوں نے بڑی دلسوزی سے کہا "خدا را ایسا نہ کیجئے۔ بنگالی اسے کبھی برداشت نہیں کریں گے"[۲] مگر انسان جب اقتدار کی ہوس میں اندھا ہو جائے تو کب کسی کی سُنتا ہے۔

التواءِ اجلاس

یحییٰ خاں یہ فیصلہ تو کر چکے تھے کہ ۳ مارچ ۷۱ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوگا۔ لیکن بیچ یہ آپڑا تھا۔ کہ چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں میں سوائے خان عبدالقیوم خاں کے اور کوئی آلۂ کار بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ پورے ملک میں دوسرا خان عبدالقیوم کوئی تھا ہی نہیں۔ یحییٰ خاں مولانا مفتی محمود، خان عبدالولی خاں، میاں ممتاز محمد دولتانہ اور مولانا شاہ احمد نورانی وغیرہ سے ٹکا سا جواب لے چکے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر مسٹر بھٹو نے اپنی "بہترین صلاحیتوں" کا مظاہرہ کیا۔ "اقبال پارک" لاہور میں ایک بہت بڑے جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی ریڈیو پر بہت تشہیر ہوئی۔ بھٹو صاحب نے اس جلسۂ عام میں اعلان کیا "ہم ۳ مارچ کو ڈھاکہ

---

[۱] "پاکستان کا المیہ" ص ۷۵ از میجر جنرل فضل مقیم خاں (ریٹائرڈ)

[۲] "پاکستان کا المیہ" ص ۷۶ از میجر جنرل فضل مقیم خاں (ریٹائرڈ)

نہیں جائیں گے۔" "پیپلز پارٹی کا کوئی رکن ڈھاکہ گیا تو اس کی ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔" "موجودہ صورت میں مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کے جو ارکان اجلاس میں شرکت کریں گے "عوام" واپسی پر اُن سے انتقام لیں گے" "۲ مارچ کو خواتین کا انتخاب ہوا تو کراچی سے خیبر تک ہڑتال کی جائے گی"[1]

اگلے روز (یکم مارچ کو) یحییٰ خاں ریڈیو پر نمودار ہوئے اور اسمبلی کے اجلاس کو کسی دوسری تاریخ تک ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ "لیگل فریم ورک آرڈر" جس کے تحت انتخابات ہوئے تھے، یحییٰ خاں کو اجلاس بلانے کا اختیار تو دیتا تھا۔ مگر اجلاس بلا کر ملتوی کرنے کی کوئی اجازت اُس میں نہ تھی۔

مزید لطف یا ستم کی بات یہ کہ یہ اقدام عین اُس وقت کیا گیا۔ جب ڈھاکا میں اجلاس کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ چیف الیکشن کمشنر اور دیگر چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں کے ارکان وہاں تھے۔

شورِ قیامت

یحییٰ خاں کے اعلانِ التوا کے بعد مشرقی پاکستان میں بھونچال آ گیا۔ لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اب اُن کے غیظ و غضب کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ اس اعلان کے چند منٹ بعد سارا ڈھاکا سڑکوں پر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام کاروبارِ زندگی معطل ہو گیا۔ ہر طبقہ مشتعل تھا حتّٰی کہ صوبائی سیکرٹریٹ کے ملازم، پی آئی اے کا عملہ اور ڈھاکا ہائی کورٹ کے ججوں اور وکیلوں تک نے اسٹرائیک کی اور جلوس نکالے۔ شیخ مجیب نے ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں بیان دیا۔

"صرف اقلیتی پارٹی کے اختلاف کی بناء پر آئین سازی کے جمہوری عمل کو

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور یکم مارچ ۱۹۷۱ء

مسدود کر دیا گیا ہے۔ اور قومی اسمبلی کو غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ ہم آبادی کی اکثریت کے نمائندے ہیں اور ہم اس فیصلہ کو چیلنج کئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اگر سازشی ٹولہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آیا۔ تو آپ اپنی آنکھوں سے تاریخ بنتی دیکھیں گے"[1] اس کے ساتھ ہی انہوں نے یکم مارچ سے ایک ہفتہ کی مکمل ہڑتال اور ۷ مارچ کو ایک بہت بڑے جلسۂ عام کا اعلان کر دیا۔ اپنے انداز کی یہ منفرد اور نہایت خوفناک احتجاجی تحریک تھی۔ جس نے صوبے کے نظم و نسق کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مشرقی پاکستان کو باقی دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کا رابطہ صرف فوج اور فضائیہ کے ٹیلیفون کے ذریعے ہی ممکن رہ گیا۔ اس موقع پر ایڈمرل احسن (گورنر) نے بڑے درد والحاح سے یحییٰ خاں کو سمجھایا کہ "حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ اور اب ان کا کوئی مداوا باقی نہیں رہا۔ اس صورتِ حال پر سیاسی وسائل کے سوا کسی اور طریقہ سے قابو پانا ناممکن ہے"[2] یحییٰ خاں نے اس پر عقل کے ناخن لینے کی بجائے یکم مارچ کو ایڈمرل احسن کو گورنری سے سبکدوش کر دیا۔ اور اُن کی جگہ صاحبزادہ یعقوب علی خاں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے سنبھال لی۔ یحییٰ خان چاہتے تھے "ملٹری فورس" کے ذریعے سب کو "سیدھا" کر دیا جائے۔ لیکن یحییٰ خاں کے نئے گورنر (اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر) نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک بڑے سے بڑا قتلِ عام بھی یحییٰ خاں کے مفید مطلب نتائج پیدا نہ کر سکتا تھا۔ نئے گورنر نے محض چار دن گورنری کا مزہ چکھا اور پھر استعفاء دے گئے۔ ۶ مارچ کو ان کا استعفاء منظور کر لیا گیا۔ اور اُن کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں کو گورنر اور ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر

---

[1] "پاکستان کا المیہ" ص ۷۹، ۸۰ از میجر جنرل فضل مقیم خاں (ریٹائرڈ)

[2] "پاکستان کا المیہ" ص ۸۰ از میجر جنرل فضل مقیم خاں ریٹائرڈ

بنا کر مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ اس امر سے کیا جائے کہ مشرقی پاکستان کے چیف جسٹس نے تمام ججوں کے اتفاق رائے سے ٹکا خاں کا حلف لینے سے انکار کر دیا۔ اُن کا موقف تھا: "وہ شیخ مجیب کی مجوزہ ہڑتال پر ہیں۔ لہٰذا وہ کام نہیں کر سکتے"[1]

اس دوران (غالباً ۳ مارچ کو) یحییٰ خاں نے گول میز کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ لیکن حالات نے جو رُخ اختیار کر لیا تھا۔ اُس کے باعث شیخ مجیب نے گول میز کانفرنس کی تجویز مسترد کر دی۔ اس کا کہنا تھا "یہ دعوت بندوق کی نوک پر دی جا رہی ہے"

۷ مارچ کو شیخ مجیب نے پلٹن میدان میں ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ یہ افواہ عام تھی کہ شیخ مجیب ۷ مارچ کو مشرقی پاکستان کی آزادی کا یکطرفہ اعلان کر دیں گے۔ مفاد پرست اندرونی و بیرونی طاقتیں چاہتی تھیں کہ حالات اور زیادہ خراب ہو جائیں۔ مولانا بھاشانی اپنے داؤں پر تھے۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں بار بار بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر رہے تھے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کر دیا "شیخ مجیب الرحمٰن ۷ مارچ کے جلسۂ عام میں بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کریں" عوامی لیگ کا انتہا پسند گروپ جس کی قیادت مسٹر تاج الدین کے ہاتھ میں تھی وہ بھی یہی مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ یحییٰ خان سے اب کسی نیکی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ وہ عوامی لیگ کو اقتدار کبھی نہ دے گا۔ ادھر بنگالی نوجوانوں کی ذہنی بغاوت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ اس ماحول میں ۷ مارچ کے جلسۂ عام کا انعقاد ہوا۔ شیخ مجیب جب جلسہ گاہ میں آئے تو ہر سُو بنگلہ دیشی پرچموں کی فصل اُگی ہوئی تھی۔ لیکن شیخ مجیب نے اس موقع پر ایک نہایت مؤثر تقریر کی۔ اور

---

[1] "پاکستان کا المیہ" ص ۸۰ از میجر جنرل فضل مقیم خاں (ریٹائرڈ)

بڑی حکمتِ عملی سے آزادی کے یکطرفہ اعلان کو ٹال گئے۔ شیخ نے غضب ناک عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے بعد اعلان کیا کہ عوامی لیگ ان شرائط پر قومی اسمبلی میں شمولیت پر غور کرے گی۔

۱۔ فوجوں کو فوراً بیرکوں میں واپس بلا لیا جائے۔

۲۔ شہریوں پر فائرنگ فوری طور پر بند کر دی جائے۔

۳۔ فوجی تیاریاں اور مغربی پاکستان سے مسلّح افراد کی اتنی تیزی سے آمد فوراً ختم کی جائے۔

۴۔ مارشل لاء فوری طور پر ہٹا لیا جائے۔ اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

یہ سب کچھ اب وہی جماعت کر رہی تھی۔ جس نے الیکشن جیتنے کے بعد کسی طرح کی بے آئینی اختیار نہ کی تھی۔ نہ کسی قانون کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور نہ غیر بنگالیوں میں کوئی خوف وہراس پیدا کیا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس کے باوجود تھا۔ کہ انہیں بتایا گیا "پنجاب اور سندھ طاقت کے سرچشمے ہیں"۔

مفتی صاحب کا تاریخی رول

جب حالات اس درجہ بگڑ گئے۔ تو مولانا مفتی محمود نے نہایت ہمت و تدبر سے کام لیکر حالات کو سدھارنے کی ایک بھرپور کوشش کی۔ مفتی صاحب نے ۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور میں تمام چھوٹے پارلیمانی گروپوں کا ایک اجلاس بلایا جس میں جمعیتہ علماءِ اسلام۔ جمعیتہ علماء پاکستان، جماعت اسلامی، کونسل اور کنونشن مسلم لیگ کے رہنما اور آزاد ارکان کے نمائندے سر جوڑ کر بیٹھے۔ مولانا مفتی محمود نے اجلاس کی صدارت کی۔ ان رہنماؤں نے نہایت جرأت مندی و حقیقت پسندی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے ایک ایسی قرارداد منظور کی۔ جس کے ایک ایک لفظ سے حبّ الوطنی کی مہک پھوٹتی ہے۔ انہوں نے کہا "موجودہ بحران کے دوران جو ملک کے وجود ہی کے لئے خطرہ بن گیا ہے ہر محبِ وطن کا پہلا اور واحد فریضہ قومی اتحاد اور ملکی سالمیت کا تحفظ ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے اتحاد کے بغیر نہ تو پاکستان رہ سکتا ہے اور نہ تصورِ پاکستان کا نظری اور علمی جواز باقی رہتا ہے۔ اس اتحاد کی واحد بنیاد وسیلہ اور یقین ہیں۔ کہ لوگ بھائی چارے، رفاقت اور باہمی انصاف کی بناء پر آزادی سے مل جل کر رہنے کے متمنی ہوں۔ پاکستان کے ہر بازو اور فی الحقیقت ملک کے ہر حصہ کے مفادات اور خواہشات کی حفاظت افہام وتفہیم، دلیل وبرہان، سمجھوتوں اور معاہدوں سے ممکن ہے لیکن دھمکی، دباؤ، قوت آزمائی اور تشدد کا کوئی جواز نہیں اور اگر کوئی ان خطوط پر سوچتا ہے تو وہ ہماری آزادی اور سالمیت کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ملک کو جس بحران کا سامنا ہے۔ وہ آئینی یا سیاسی نہیں۔ عوام نے جو نمائندے منتخب کئے تھے۔ ایک سو دن گذرنے کے باوجود ان کو مل بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ مستقبل سے متعلق امور پر تبادلہ خیال اور افہام وتفہیم تو بعد کی بات ہے۔ دریں اثناء قومی اسمبلی میں ملک کے عوام کی اکثریتی جماعت کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن نے کھلے عام یہ یقین دلایا ہے کہ دستور میں تمام معاملات پر بلا تعصب ہر رکن کا نکتہ نگاہ معلوم کیا جائے گا۔ اور ہر معقول تجویز پر سنجیدہ توجہ دی جائے گی۔ ایوان کے باہر جن سمجھوتوں پر اصرار کیا جاتا ہے یا جو سمجھوتے ہوئے ہیں، عوام کی تنقیدی نگاہ سے اوجھل ہونے کے باعث مطلوبہ آئینی مفاہمت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے ایسے سمجھوتے اقتدار سے حصہ لینے کے لئے ہو سکتے ہیں۔

گذشتہ پندرھواڑے میں جو پریشان کن واقعات رونما ہوئے ہیں المناک

ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے ایسے خوف اور شکوک پیدا ہو گئے ہوں کہ عوام کے فیصلے کی نفی اور اکثریتی پارٹی کو وزن اور تاثیر سے محروم کرنے کے لئے غیر جمہوری چیرہ دستیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ہم سیاسی جماعتوں کے نمائندے اور مغربی پاکستان کے ایم۔ این۔ اے جو اس اجلاس میں جمع ہوئے ہیں صاف طور پر یہ اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم ایسی کوششوں کا مقابلہ کرنے اور انہیں ناکام بنانے میں اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کے ساتھ ہوں گے۔ تاہم ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔ کہ موجودہ بحران بڑی حد تک غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فوری قدم جو اٹھایا جا سکتا ہے یہ ہے کہ صدرِ پاکستان ڈھاکہ جائیں اور شیخ مجیب الرحمٰن سے مل کر بلا تکلف یہ سارے شکوک و شبہات، خوف اور بدگمانیاں دور کریں۔ مشرقی پاکستان میں صورتِ حال کی تباہ کن سنگینی اور تخریبی قوتوں کو فائدہ پہنچانے والے جوش و خروش کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن نے چار مطالبات کر کے اپنی عالی ظرفی اور حب الوطنی کا وافر ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ یہ چار مطالبات علاقائی یا گروہی نوعیت کے نہیں بلکہ قومی طرزِ فکر پر مبنی ہیں۔

ہماری حتمی رائے یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں فائرنگ کے واقعات کی تحقیقات اور فوجوں کی بیرکوں میں واپسی کے بارے میں عوامی لیگ کے مطالبات فی الفور تسلیم کئے جانے چاہئیں۔ مارشل لاء کے خاتمہ اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی کے مطالبات پوری قوم کے مشترکہ مطالبات ہیں اور نہ صرف عوام اس کے لئے دیر سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ بلکہ خود صدرِ مملکت نے ان کی تکمیل کی جانب شاندار اقدامات کئے ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی منتخب ہو چکی ہے۔ اور اس کے سامنے بھی یہی مقصد ہے۔ لیکن بدلے ہوئے حالات کا تقاضا ہے کہ اس ضمن میں شیخ مجیب الرحمٰن کے مطالبات کو فوری طور پر عملی جامہ پہنایا

جائے۔ اس ضمن میں دستوریہ جو بھی فیصلہ کرے گی وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو قومی اسمبلی کی اکثریتی جماعت کے لیڈر کی حیثیت سے آئین کی تیاری اور نفاذ سے قبل عبوری مدت کے لئے حکومت بنانے کی دعوت دی جانی چاہیئے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ تمام اقدامات تیزی سے کئے جائیں تاکہ قومی اسمبلی کا اجلاس طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۵ مارچ کو شروع ہو جائے[1]

اس اجلاس میں مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، پروفیسر عبدالغفور، مولانا عبدالحکیم، سردار شوکت حیات، خواجہ جمال محمد کوریجہ، سردار مولا بخش سومرو اور مولانا ظفر احمد انصاری شریک ہوئے۔ اس قرارداد کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ یحییٰ خان جو اپنے مارشل لاء حکام کے بار بار اصرار کے باوجود ڈھاکا نہیں جا رہا تھا۔ اُسے با دلِ نخواستہ ڈھاکا جانا پڑا۔

مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی

یحییٰ خان دل سے شیخ مجیب کا اقتدار تسلیم نہیں کرتا تھا۔ مگر ہر طرف سے دباؤ پڑنے پر وسط مارچ میں اپنے لاؤ لشکر سمیت ڈھاکا پہنچکر اس نے شیخ مجیب کے ساتھ مذاکرات کا "ناٹک" شروع کر دیا۔ بعد میں مغربی پاکستان کی چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں کے رہنماؤں مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، میاں ممتاز محمد دولتانہ اور پروفیسر عبدالغفور وغیرہ کو بھی ڈھاکا آنے کی دعوت دی گئی۔ خان عبدالولی خان پہلے ہی ڈھاکا میں تھے۔ سب سے بعد میں مسٹر بھٹو اور خان عبدالقیوم

---

[1] روزنامہ "امروز" لاہور ۱۴ر مارچ ۱۹۷۱ء

خان وہاں پہنچے۔ اور بقول مولانا مفتی محمود مذاکرات کا "چکر" چلتا رہا، "چکر" اس لئے کہ ملاقاتیں واقعی ایک گول چکر میں ہو رہی تھیں۔ یعنی یحییٰ مجیب مذاکرات، یحییٰ بھٹو مذاکرات، بھٹو مجیب مذاکرات، یحییٰ، مجیب، بھٹو مذاکرات، درمیان میں کہیں کہیں مغربی پاکستان کے دوسرے لیڈروں سے یحییٰ خان کی بات چیت ہو جاتی یا ان لیڈروں سے کہا جاتا۔ کہ وہ مجیب سے بات کریں۔ اقلیتی گروپ کے لیڈر مجیب سے ملتے تو وہ کہتا "یحییٰ خاں کے ارادے نیک نہیں ہیں" وہ اس بات سے انکار کرتا کہ میں ملک توڑنا چاہتا ہوں۔ جب یحییٰ خاں سے اس ضمن میں بات کی جاتی تو وہ کہتا "نہیں ایسا نہیں ہے" لطف یہ کہ ان دس روزہ مذاکرات میں ایک دفعہ بھی تمام جماعتوں کے رہنماؤں کو ایک میز پر بٹھا کر باہمی مبادلۂ افکار کا موقع نہ دیا گیا۔ اقلیتی جماعتوں کے لیڈر محسوس کرنے لگے، کہ یحییٰ خاں کے عزائم واقعی خطرناک ہیں۔ جیسا کہ مفتی صاحب نے حمود الرحمٰن کمیشن کے روبرو بیان کیا۔ "ان ایام میں جب ہم مجیب اور یحییٰ خاں سے ملتے تو ہمیں ماحول کچھ پُر اسرار سا معلوم ہوتا۔ جیسے دریائی سطح بظاہر پُر سکون ہو مگر نچلی سطح پر تلاطم خیز موجیں باہم دست و گریباں ہوں[1]" ۲۳ر مارچ کو تمام اقلیتی پارٹیوں کے نمائندوں نے (خان عبد القیوم کے سوا) شیخ مجیب سے ملاقات کی۔ شیخ نے میاں ممتاز دولتانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "(ان سے کہو) ہمیں کیوں مارنا چاہتے ہو؟ ہمیں اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تو نہ رکھو، ہمارے عوام کو قتل کرنے کے منصوبے تو نہ بناؤ[2]" اسی رات خان عبد الولی خاں۔ یحییٰ خاں سے ملے تو یحییٰ خاں نے اُن سے کہا:

---

[1] "مفتی محمود کی سیاست" ص ۱۲۰ از قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ

[2] ہفت روزہ "زندگی" لاہور کو خان عبد الولی خاں کا انٹرویو ص ۱۰، ۲۸ر فروری ۱۹۷۲ء

"THERE IS NO OTHER WAY LEFT EXCEPT TO SHOOT MY WAY THROUGH."

۲۴؍ مارچ کی صبح کو ولی خاں شیخ مجیب سے الوداعی ملاقات کرنے گئے تو شیخ نے آبدیدہ ہو کر کہا: "تم اس بدقسمت سرزمین سے جتنی جلدی ہو سکے واپس چلے جاؤ، شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں، یحییٰ خاں رات بارہ بجے سے لیکر صبح تک اپنے جرنیلوں سے مشورہ کرتا رہا ہے،

"THEY HAVE DECIDED TO SHOOT THEIR WAY THROUGH"[1]

گویا شیخ مجیب کو ۲۴؍ مارچ کی صبح ہی کو علم ہو چکا تھا۔ کہ اُس کے ساتھ کیا ہونیوالا ہے یحییٰ خاں مذاکرات کی آڑ میں سری لنکا کے راستے خاص بڑی تعداد میں فوج مشرقی پاکستان پہنچا دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب کامیاب فوجی آپریشن ممکن ہو گیا ہے تو اُس نے اپنے ہی ملک پر "فوج کشی" کا حکم صادر کر دیا۔ ۲۵؍ مارچ کو رات ڈیڑھ بجے شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور بقول میجر جنرل فضل مقیم خاں "اُس منحوس رات کو ڈھاکا میں جو خوفناک شور برپا ہوا اس سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ گویا جدید اسلحہ سے اصلی جنگ لڑی جا رہی ہے"[2] ۲۶؍ مارچ کو یحییٰ خاں نے ریڈیو پاکستان سے تقریر کرتے ہوئے ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ عوامی لیگ اور شیخ مجیب پر "غداری" کی فرد جرم عائد کی۔ اور شیخ مجیب کی گرفتاری اور عوامی لیگ کو غیر قانونی جماعت قرار دینے کا اعلان کیا۔ یہ اس شخص

---

[1] ہفت روزہ "زندگی" لاہور کو خان عبدالولی خان کا انٹرویو ۲۸؍ جنوری ۱۹۷۲ء ص ۱۰

[2] "پاکستان کا المیہ" ص ۱۰۴، از میجر جنرل فضل مقیم خاں ریٹائرڈ

کا انجام تھا جو بقول یحیٰ خان ملک کا ہونے والا وزیر اعظم تھا۔ ۲۶ مارچ کو مسٹر بھٹو مشرقی پاکستان سے کراچی واپس پہنچے، ہوائی اڈے پر بیان دیا "خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کو بچا لیا گیا"[۱] یہ پہلا بیان تھا جو حکومت کے انتہائی ظالمانہ اقدام کے حق میں جاری ہوا۔

مغربی پاکستان کے دیگر پارلیمانی گروپوں کے لئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا، بالخصوص نیپ اور جمعیۃ سرحد اور بلوچستان میں اپنی سیاسی اہمیت کے باعث "موت" کے منہ پر کھڑی تھیں۔ حکومت کو اندیشہ تھا کہ یہ سر پھرے لوگ کہیں کھلی مخالفت پر نہ اتر آئیں۔ چنانچہ حکومتی حلقوں کی طرف سے خان عبدالولی خان اور مولانا مفتی محمود پر دباؤ ڈالا گیا۔ کہ وہ بھی مسٹر بھٹو کی "پیروی" کریں۔ لیکن ان دونوں نے اپنی روایت کے مطابق "سر جھکانے" سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً "سرکاری توپ" خان عبدالقیوم خان نے ان دونوں جماعتوں پر فائر کھول دیا۔ نیپ اور جمعیۃ "ملک دشمن" قرار دی جانے لگیں۔ اور ان پر پابندی (BAN) کا پرزور مطالبہ ہونے لگا۔ گویا خان صاحب ان دونوں جماعتوں کا بھی "گھلوگھارا" کروانا چاہتے تھے۔ نیپ کی حد تک وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن جمعیۃ کی باری آنے تک خود یحیٰ خان کا "وقت موعود" آ گیا۔ حالات نے اسے اجازت ہی نہ دی کہ وہ جمعیۃ کو موت کے گھاٹ اتار سکے۔

مفتی صاحب کی حُبّ الوطنی

جب مشرقی پاکستان میں اندرونی خلفشار شدید تر ہو گیا تو ہندوستان نے

---

[۱] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء

مشرقی سرحدوں پر خطرے کا الارم بجا دیا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ نے اس موقع پر ایک خوفناک مضمرات کی حامل قرارداد منظور کی۔ یہ گویا پاکستان کے خلاف ہندوستان کا ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا۔

مولانا مفتی محمود نے یکم اپریل ۷۱ء کو پشاور میں ہندوستان کے اس اقدام کی سخت مذمت کی اور کہا:

> "ہندوستان کی یہ کارروائی پاکستان کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ ہندوستان کی یہ کارروائی پریشان کن اور تشویشناک ہے، حکومت کو ہندوستان کی مسلّح مداخلت کو کچلنے کے لیے کسی کارروائی سے گریز نہیں کرنا چاہیے، انہوں نے ہندوستانی پارلیمنٹ کی قرارداد کو پاکستان کے معاملات میں کھلی مداخلت قرار دیتے ہوئے کہا کہ بھارت نے انتہائی ڈھٹائی کیساتھ پاکستان دشمنی کی جو کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔ پاکستان کو بین الاقوامی برادری کی توجہ اس طرف دلانی چاہیے"[1]

۱۱ اپریل کو مفتی صاحب نے ملتان میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا، جس میں ہندوستان کی مذموم سرگرمیوں کے مضمرات و نتائج پر گفتگو کرتے ہوئے اور زیادہ شدت کے ساتھ بعض نکات اٹھائے۔ انہوں نے کہا:

الف: بھارت پاکستان کا ازلی و ابدی دشمن ہے، لہٰذا اس کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیئے جائیں۔

ب: بھارت ہمیشہ سے پاکستان کے معاملات میں مداخلت کرتا آیا ہے اسے ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

---

[1] روزنامہ "امروز" لاہور ۲ اپریل ۱۹۷۱ء

ج: بھارت کی شر انگیزی کو مستقل طور پر ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام کو جہاد کے لئے تیار کیا جائے ۔

د: بیرونی ممالک میں بھارتی پروپیگنڈا کا جواب دینے کے لئے سیاسی رہنماؤں اور علماء پر مشتمل وفود بھیجے جائیں ۔

ہ: اس موقع پر چین نے جس طرح بھارتی رویہ کی پُرزور مذمت کی ہے وہ قابلِ تحسین اور لائقِ شکریہ ہے۔ اس سلسلہ میں چین کی مکمل حمایت اور مزید ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں ۔

و: سلامتی کونسل میں نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ حیدر آباد اور جوناگڑھ ایسی مسلم ریاستوں پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کو پوری شدّت سے چیلنج کیا جائے ۔

ز: بھارت کے اندر اپنی آزادی کی جنگ لڑنے والے میزوؤں اور ناگا قبائل کی آزاد حکومتوں کو تسلیم کر لیا جائے ۔

ح: اس نازک وقت میں تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے فروعی اختلافات ختم کر دینے چاہئیں[1] ”

یحییٰ خان کو بادۂ دوشینہ کی سرمستیوں اور صبیح و ملیح صورتوں سے فرصت ہوتی تو وہ مفتی صاحب کی ان باتوں پر غور کرتے ، وہاں تو "جانِ عالم پیا" کی یاد تازہ ہو رہی تھی، جب کہ ہمارے دوست ملک چلا رہے تھے :-

"ہمیں نہایت افسوس سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کے حالیہ واقعات کے دوران اسلام آباد اپنی آواز دنیا تک نہیں پہنچا سکا ..... صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ "میں راستی پر ہوں" دوسروں

---

[1] روزنامہ "امروز" ملتان ۱۲ر اپریل ۱۹۷۱ء

کو آپ کی راستی کا یقین ہونا ضروری ہے[1]۔"

ہندوستان نے اس بحران میں ہمارے خلاف پروپیگنڈا مہم پر کوئی ایک کروڑ بیس لاکھ پاؤنڈ کی رقم خرچ کی[2]۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈر، بھارتی کابینہ کے نصف درجن وزراء بشمول وزیر خارجہ اس سلسلہ میں یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے دورے پر گئے۔ جے پرکاش نرائن شاید پہلی شخصیت تھے۔ جنہوں نے مئی ۱۹۷۱ء میں اپنا سفر شروع کیا اور چھیالیس ملکوں کے دورے کئے[3]۔ یہ ہمارے دشمن کا حال تھا۔ ہمارا حال؟

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی،
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے!

دورۂ مشرقِ وسطیٰ

جب مولانا مفتی محمود نے یحییٰ خاں کی ماتم انگیز بے حسی دیکھی تو وہ تڑپ کر اٹھے اور جولائی کے اوائل میں جمعیتہ علماء اسلام کی طرف سے ایک ۳ رکنی وفد لے کر مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہوگئے۔ یہ روانگی ۱۰ ر جولائی ۱۹۷۱ء کو عمل میں آئی۔ وفد میں مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی اور حاجی غلام محمد شامل تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حکومت نے اس وفد کو کسی قسم کی سہولت فراہم کرنا قطعاً گوارا نہ کی۔ وفد کے مقاصد میں بھارتی پروپیگنڈا کا جواب، مشرقی پاکستان کی صحیح صورتِ حال کا بیان اور مسلم ممالک کے اتحاد کی کوششیں

---

[1] اخبار "عدالت" انقرہ (ترکی) ۲۴ ر جون ۱۹۷۱ء
[2] "پاکستان کا المیہ" ص ج از میجر جنرل فضل مقیم خاں (ریٹائرڈ)
[3] ایضاً ص ۱۹۷

شامل تھیں۔ مصر کے علاوہ لیبیا، سوڈان، شام، لبنان، سعودی عرب اور کویت کا دورہ اس پروگرام میں شامل تھا۔

اس دورہ میں جمعیتہ کے وفد کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے عربوں کو مشرقی پاکستان کی صحیح صورتِ حال بتائی۔ خاص طور پر بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم کا پردہ چاک کرتے ہوئے انہیں اسرائیل کے عزائم سے ہم آہنگ کیا۔ لیبیا میں اس وفد کا بہت زیادہ خیر مقدم ہوا۔ وہاں کے اخبارات ریڈیو اور ٹی وی نے اس وفد کو بہت اہمیت دی۔

اس دورے سے واپسی پر مولانا مفتی محمودؒ نے لاہور میں کارکنوں کو اپنے دورہ کے تاثرات بتاتے ہوئے حکومت کو تجویز پیش کی کہ بھارتی مداخلت کا اب ایک ہی حل رہ گیا ہے۔ اور وہ ہندوستان کے خلاف بھرپور جنگ ہے، مشرقی پاکستان کی موسمی صورتِ حال کے پیشِ نظر نہایت ضروری تھا۔ کہ پاکستان نومبر دسمبر آنے سے پیشتر ہی ہندوستان پر ہلہ بول دے۔ ورنہ پھر بارشوں اور طوفانوں کے باعث لڑنا مشکل ہو جاتا۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب خارجہ امور کے "ایکسپرٹ سیاستدان" یہ تاثر دے رہے تھے کہ ہندوستان سے جنگ نہیں ہوگی۔ جبکہ ایک "بوریہ نشین" ان "ایکسپرٹ سیاستدان" کو یقین تھا۔ جنگ ناگزیر ہو چکی ہے اور پیشتر اس سے کہ ہندوستان ہم پر کوئی بڑا حملہ کرے ہمیں پہل کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا مفتی محمود نے یحییٰ خاں پر زور دیا کہ:

> "وہ بھارت کے خلاف جنگ شروع کرے۔ مشرقی پاکستان میں بھارت کی مسلح مداخلت اور جارحیت کی وجہ سے سرد جنگ جاری ہے۔ ان حالات میں پاکستان اگر بھارت پر حملہ کر دے تو مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام متحد ہو کر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے

اس جہاد میں شریک ہو جائیں گے۔ بھارت کو سبق سکھانے کے لئے جنگ ناگزیر ہو گئی ہے[1]"

اس جنگ کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستان اپنے نومبر دسمبر ۷۱ء والے پروگرام کو ملتوی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس دوران سیاسی محاذ پر تیزی سے بعض اقدامات کر کے مشرقی حصہ کے حالات بہتر بنائے جا سکتے تھے۔ مگر یحییٰ خاں نے یہ موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ جبکہ ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل مانک شاہ کو اُس کی توقع کے عین مطابق نومبر دسمبر کے مہینے حاصل ہو گئے۔ اور اُس نے اُن سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔

سیاست کا جوار بھاٹا

مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے بعد سیاست کے جوار بھاٹے میں کئی اُتار چڑھاؤ آئے۔ اگر شیخ مجیب کی اکثریت قائم رہتی تو ظاہر ہے مسٹر بھٹو کو اقتدار نہ مل سکتا تھا۔ انہوں نے یحییٰ خاں کی معرفت شیخ مجیب کی اکثریت کو سبوتاژ کیا اور فوجی کارروائی کی مکمل حمایت کی۔ اب مشرقی پاکستان آگ اور خون میں نہا رہا تھا اور مسٹر بھٹو مغربی پاکستان کی حد تک اقتدار کی آرزو لیے یحییٰ خاں سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ مغربی صوبہ میں انتقال اقتدار فوراً عمل میں آجائے۔ وہ یہاں اپنے سوا کسی کا وجود تسلیم نہ کرتے تھے۔ خان عبدالقیوم صوبہ سرحد میں برسر اقتدار آنے کے لئے نیپ پر بجلیاں گرا رہے تھے، مولانا مفتی محمود نے اس دور میں تمام دباؤ کے باوجود نہایت جرأت واستقامت

---

[1] روزنامہ "مشرق" لاہور ۳۰ر اگست ۱۹۷۱ء

سے حالات کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے یحییٰ، بھٹو اور خان قیوم کے "نگڈم" پر بھرپور وار کئے، اور اُن کے سامنے "سرنڈر" (SURRENDER) سے انکار کر دیا۔ ۱۳ رمئی ۷۱ء کو انہوں نے پشاور میں جمعیتہ کے پارلیمانی گروپ کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اور ایک قرار داد منظور کرائی جس میں اس مرحلہ پر انتقالِ اقتدار کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے کہا کہ "جب تک مشرقی پاکستان ذہنی طور پر انتقالِ اقتدار کے لئے تیار نہیں ہو جاتا اس قسم کی کوئی تجویز ملکی مفاد میں نہیں ہوگی" "موجودہ حالات میں انتقالِ اقتدار سے مشرقی پاکستان کے عوام میں مایوسی پیدا ہوگی" اور جب ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ کیا جمعیتہ اس مطالبے کی حمایت کرتی ہے کہ ایسی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی جائے جنہوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی؛ تو مفتی صاحب نے برجستہ کہا "اگر کسی پارٹی نے قیامِ پاکستان کے بعد اس کی مخالفت کی ہو تو اس پر پابندی لگا دینی چاہیئے"[لہ]

یحییٰ خاں بہت کائیاں آدمی تھا۔ جب تک شیخ مجیب کو رستے سے ہٹانے کی بات تھی وہ بھٹو کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ جب یہ کانٹا نکل گیا تو کچھ وقفے کے بعد اُس نے مسٹر بھٹو کو ٹھینگا دکھا دیا۔ اور نئی حکمتِ عملی اختیار کی۔ ۲۸ رجون ۷۱ء کو اُس نے دستور سازی کے مسئلے پر ایک نشری تقریر کی اور ملک کو قابلِ ترمیم دستور دینے کا اعلان کیا، نیز دستور کے رہنما اصولوں کا بھی ذکر کیا جن میں اسلامی نظریہ، ملکی استحکام اور سالمیت کا تحفظ شامل تھا۔ دستور سازی کی تفصیلات طے کرنے کے بارے میں کہا کہ وہ سیاسی و قومی رہنماؤں کے مشوروں کے بعد طے کی جائیں گی،

انتقالِ اقتدار کے بارے میں کہا کہ یہ ملک کے دونوں حصوں میں بیک وقت ہوگا۔

[لہ] روزنامہ "مشرق" لاہور ۱۴ رمئی ۱۹۷۱ء

ساتھ ہی نئے انتخابات کے امکان کو رد کیا۔ مخصوص ملکی حالات کے پیشِ نظر تمام سیاسی رہنماؤں نے یحییٰ خاں کی اس تقریر کا خیر مقدم کیا۔

جولائی کے اوائل میں مفتی صاحب جمعیۃ کا ایک وفد لیکر مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر چلے گئے اور اگست کے اواخر میں واپس آئے۔ ادھر یحییٰ خاں نے بظاہر مشرقی پاکستان میں حالات کو پُرسکون اور پُرامن بنانے کے لئے ڈاکٹر اے ایم مالک کو گورنر مقرر کر دیا۔ علاوہ ازیں ایک نام نہاد کابینہ کا بھی اعلان کیا۔ یحییٰ خاں دراصل مغربی حصہ میں بھی یہی کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ یہاں آئینی طور پر تین جماعتیں ملک کے مستقبل کی مالک نظر آتی تھیں۔ پنجاب و سندھ میں پیپلز پارٹی واضح اکثریت میں تھی۔ جس کے لیڈر مسٹر بھٹو پر یحییٰ خاں بوجوہ اعتماد کرنے کو تیار نہ تھے۔ جبکہ بلوچستان و سرحد میں نیپ اور جمعیۃ متوقع حکمران جماعتیں تھیں۔ یہ لوگ یحییٰ خاں کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ ان سب کو راہ سے ہٹانے کے لئے خان عبدالقیوم خاں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ خان صاحب نے ملک بھر میں نئے انتخابات کا راگ چھیڑ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے صوبوں میں بھی موجودہ اکثریت کو ختم کر کے اپنی پسند کے نئے ممبروں کو منتخب کروا کر کاروبارِ سلطنت سنبھال لیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو کالعدم قرار دیکر راستہ پہلے ہی صاف کیا جا چکا تھا۔ (جہاں سو سے زائد نشستیں خالی قرار دی جا چکی تھیں) ساتھ ہی خان عبدالقیوم خان نے نیپ اور جمعیۃ کے خلاف نیا محاذ کھول دیا۔ ”قیامِ پاکستان کی مخالف جماعتوں کو اقتدار نہ دیا جائے“۔ ”مفتی محمود کانگریس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں“۔ ”ولی خان پاکستان کا مخالف ہے اور پختونستان قائم کرنا چاہتا ہے“۔ ”قیامِ پاکستان کی مخالف جماعتیں پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں“۔ ”مغربی پاکستان میں بھی مجیب کے ایجنٹ تخریبی کارروائیوں

میں مصروف ہیں، ان جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا جائے'' ان تمام باتوں کا مقصود یہ تھا۔ کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں سیاسی بدامنی پیدا کر کے مغربی حصے کے انتخابی نتائج کو سبوتاژ کیا جائے۔ خان قیوم یہ خدمت اس یقین دہانی پر انجام دے رہے تھے کہ کامیابی کی صورت میں صوبہ سرحد میں حکومت اُن کی ہو گی، یہ ایک انتہائی احمقانہ پروگرام تھا۔ جو سنگین ملکی حالات سے یکسر بے نیاز ہو کر کندۂ ناتراش اور ہوسِ اقتدار میں اندھے یحییٰ خاں اور قیوم خان نے مرتب کیا تھا۔

ان حالات میں یکم ستمبر ۷۱ء کو مفتی صاحب نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس بلائی اور خان عبدالقیوم خان کا نہایت سختی کے ساتھ محاسبہ کیا۔ اور کہا۔ ''خان عبدالقیوم خاں وہ شخص ہیں جنہوں نے ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو کراچی میں چھ نکات کو من و عن تسلیم کر لیا تھا۔ جبکہ مغربی پاکستان کے کسی بھی رہنما نے چھ نکات کو پورے کا پورا تسلیم نہیں کیا'' خان عبدالقیوم خان نے ڈھاکہ جاتے ہوئے کراچی ائر پورٹ پر کہا تھا:

"KHAN QAYYUM SAID THAT IN VIEW OF THE GEOGRAPHICAL DIFFRENCE BETWEEN THE TWO PARTS OF THE COUNTRY, THE SIX-POINT PROGRAMME OF THE AWAMI LEAGUE SHOULD BE ACCEPTED[1]"

مفتی صاحب نے یہ انکشاف کر کے سب کو ہکا بکا کر دیا کہ ''خان قیوم فروری ۶۷۱

---

[1] روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء

میں سرحد دارالعلوم پشاور میں مجھ سے ملے تو انہوں نے تجویز کیا۔ کہ ہندوستان سے بات کی جائے کہ وہ کشمیر پاکستان کو دے دے اور مشرقی پاکستان لے لے، مفتی صاحب نے کہا کہ خان عبدالقیوم خان نے کہا "مشرقی پاکستان چھوڑ دیا جائے"۔[1]

خان عبدالقیوم اس انکشاف پر بہت برہم ہوئے۔ جس پر مفتی صاحب نے انہیں چیلنج دیتے ہوئے کہا "اگر یہ باتیں غلط ہوں تو قیوم خاں مجھ پر مقدمہ چلائیں۔ میں عدالت میں گواہ پیش کروں گا"۔[2]

مگر ع واں ایک خامشی ترے سب کے جواب میں

خان عبدالقیوم بھاگ گئے، اور جا کر یحییٰ خاں کے چرنوں میں پناہ لی۔

نئے انتخابات کے بارے میں مفتی صاحب نے کہا "نئے انتخابات کا مطالبہ کرنے والے جمہوریت کے دوست نہیں ہو سکتے۔ قیوم خاں اور اُن جیسے دوسرے لوگ اس طرح پوری قوم کو جمہوریت سے توبہ کرانے کے درپے ہیں"، یہی وہ دور ہے جب مسٹر بھٹو کو بھی یاد آیا کہ مشرقی پاکستان میں خون بہہ رہا ہے، اور انہوں نے "THE GREAT TRAGEDY" نامی کتاب لکھی۔

سہ جماعتی اتحاد

خان عبدالقیوم خاں کی مہرہ بازی کے باعث حالات میں جو نیا تغیر پیدا ہوا۔ اُس نے جمعیتہ اور نیپ کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ صوبہ سرحد میں وزارت سازی کے معاملہ میں ابھی تک جمعیتہ کا کسی پارٹی سے [illegible]

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور ۲ ستمبر ۱۹۷۱ء

[2] ایضاً ۲۶ ستمبر ۱۹۷۱ء

باضابطہ سمجھوتا نہیں ہوا تھا جہاں پارٹی پوزیشن کچھ اس طرح قائم ہوئی تھی۔ کہ جمعیتہ کے تعاون کے بغیر کوئی جماعت بھی اپنی حکومت قائم نہ کر سکتی تھی جمعیتہ نے اس پوزیشن کو اپنے نصب العین (اسلامی نظام) کے حصول کے لئے بھرپور انداز میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جمعیتہ بلاشبہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہی اور ملکی سیاست پر اس کا انتہائی خوشگوار اثر پڑا۔ جو آج ہر کہہ و مہہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے، مولانا مفتی محمود نے جمعیتہ کی طرف سے ایک پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا۔ جس میں سرفہرست یہ نکتہ تھا کہ جمعیتہ صرف اس جماعت سے تعاون کرے گی جو قومی اسمبلی میں آئین کو آخری شکل دینے میں جمعیتہ کے رہنماؤں کی اسلامی اصولوں کے مطابق تجاویز و ترامیم کی حمایت کرے گی۔ باقی نکات کا مفہوم یہ تھا کہ صوبہ سرحد کی حکومت جہاں تک اس کے دائرہ اختیار میں ہو، اسلام کے مطابق کام کرے گی، اس غرض سے صوبے کا وزیر اعلیٰ جمعیتہ کی طرف سے ہوگا۔ ظاہر ہے یہ فارمولا جمعیتہ کے نصب العین (اسلامی نظام کا قیام) کے اعتبار سے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ نیپ اور مسلم لیگ (قیوم گروپ) دونوں اپنی اپنی مجبوری کے باعث اس فارمولے کو تسلیم کر چکی تھیں۔ لیکن جمعیتہ نے خان قیوم کی نیش زنی کے بعد نیپ کے ساتھ معاہدے کو ترجیح دی اور اس شکر رنجی کو جو ۷۰ء کے انتخابات میں پیدا ہوئی تھی یکسر بھلا دیا۔

خان عبدالقیوم خاں اپنی سیاسی سیرت کے اعتبار سے اس قابل ہی نہ تھے کہ جمعیتہ اُن سے تعاون کرتی، مقابلتہً خان عبدالولی خاں پر جمعیتہ اعتماد کر سکتی تھی، اور اُس نے کیا اور حق یہ ہے کہ خان عبدالولی خاں صاحب نے بھی حقِ دوستی ادا کر دیا۔ بعد میں مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی نے بھی معلوم وجوہ کے باعث جمعیتہ کی شرائط پر معاہدہ کرنا منظور کر لیا۔ اس طرح صوبہ سرحد میں حکومت سازی کے معاملہ پر ان تین جماعتوں کے مابین پارلیمانی اتحاد ہو گیا۔ ۹ ستمبر کو جمعیتہ کے مرکزی دفتر

سے ایک پریس ریلیز جاری ہوا جس میں بتایا گیا کہ ''تینوں جماعتوں کے رہنماؤں کا ایک اجلاس کل یہاں ہوا جس میں تینوں جماعتیں اصولی طور پر متحدہ محاذ کے قیام پر متفق ہو گئیں''[1] نیپ، جمعیتہ اور پی پی پی کے اس اتحاد کا مطلب واضح تھا کہ صوبہ سرحد میں حکومت انہی کی بنے گی۔ لیکن خان عبدالقیوم خان نے اگلے ہی روز اعلان کر دیا کہ ''پیپلز پارٹی، جمعیتہ اور ولی نیپ کے اتحاد کے باوجود صوبہ سرحد میں اُن کی جماعت ہی حکومت بنائے گی''[2] ظاہر ہے یہ HIS MASTER'S voice تھی۔ خان عبدالقیوم خاں کا یہ بیان سرکاری خبر رساں ایجنسی ''ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان'' (A.P.P) نے کیرڈ (carried) کیا۔

مشرقی پاکستان میں سول حکومت

اس دوران ڈاکٹر اے ایم مالک نے گورنر مشرقی پاکستان کی حیثیت سے اپنا حلف اٹھایا۔ اور کابینہ تشکیل دی۔ جس میں پٹے ہوئے اور قطعی غیر نمائندہ افراد کو شامل کرنے کا اعلان کیا۔ جمعیتہ نے اس امر کی مخالفت کی اور کہا کہ اس قسم کے افراد پر مشتمل کابینہ سے حالات پُرسکون نہیں ہو سکتے۔ اگر عوامی لیگ کے اُن افراد پر مشتمل کابینہ وجود میں آجاتی جو ''محبِ وطن'' تھے اور جن کا ہنگاموں سے کوئی تعلق نہیں تھا تو امن وامان کی صورتِ حال بہتر ہو سکتی تھی۔ مفتی صاحب نے ۲۲ ستمبر کو پشاور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس مسئلے کو نہایت شدومد سے اٹھایا، انہوں نے مطالبہ کیا کہ ''اس کابینہ کو توڑ دیا جائے''[3]

---

[1] روزنامہ ''مساوات'' لاہور ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء

[2] ایضاً ۱۱ ستمبر ۱۹۷۱ء

[3] روزنامہ ''مشرق'' لاہور ۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء

مزید برآں یحییٰ خاں کے عزائم بھانپتے ہوئے مفتی صاحب نے مغربی پاکستان میں فوری طور پر اقتدار کی منتقلی کا مطالبہ بھی کیا۔ جب ایک اخباری نمائندے نے مفتی صاحب کی توجہ جمعیتہ کے سابقہ موقف کی جانب مبذول کرائی کہ حالات مکمل طور پر معمول پر آنے کے بعد ملک کے دونوں بازوؤں میں بیک وقت اقتدار کی منتقلی ہونی چاہیئے تو انہوں نے کہا کہ "ہم اب بھی اپنے اس موقف پر قائم ہیں، تاہم اس میں کوئی منطق نظر نہیں آتی کہ ایک فساد زدہ علاقے میں تو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ اور ایک پُرامن علاقہ میں انتقالِ اقتدار سے انکار کر دیا جائے..... ہم اس بات پر زور دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو جتنی جلدی اقتدار منتقل کر دیا جائے ملک کے لئے اتنا ہی بہتر ہے[1]"

ہندوستان کا حملہ

اگر یحییٰ خاں کی نیت نیک ہوتی اور وہ مشرقی پاکستان کی حقیقی نمائندہ اکثریت کے ساتھ سلسلہ جنبانی کرتا تو حالات سدھر سکتے تھے۔ مگر وہ مشرقی پاکستان میں ڈاکٹر اے ایم مالک کی حکومت کے قیام اور ضمنی انتخابات کے بعد یہ سمجھ رہا تھا۔ اب مشرقی پاکستان کے مسئلے کا سیاسی حل نکل آیا ہے، اُدھر ہندوستان مناسب وقت کی تلاش میں تھا، بالآخر ۲۲ر نومبر ۷۱ء کو ہندوستان نے تارکینِ مشرقی پاکستان کی آڑ لے کر مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ پاکستان اپنی مخصوص دفاعی حکمتِ عملی کے مطابق فوری طور پر مغربی محاذ کھول کر ہندوستان کی راہ روک سکتا تھا۔ مگر یحییٰ خاں نے ایسا نہ کیا۔ اس کے برعکس اُس نے نیشنل عوامی پارٹی پر "حملہ" کر دیا۔ ۲۶ر

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور ۲۳ر ستمبر ۱۹۷۱ء

نومبر کو یہ جماعت خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔

علماء کا فتویٰ جہاد

۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو گویا مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے ٹھیک چھٹے روز جمعیۃ کی تحریک پر شیرانوالہ دروازہ (لاہور) میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کے ہزاروں علماء کا ایک اجلاس ہوا جس میں دفاعِ وطن کی تدبیریں سوچی گئیں، اور پورے غور و خوض کے بعد جہادِ عام کا فتویٰ جاری کیا گیا۔ مولانا مفتی محمود نے موچی دروازہ میں اس کا اعلان کرتے ہوئے بتایا "جمعیۃ علماء اسلام کے زیرِ اہتمام علماء کے ایک کنونشن نے بھارتی جارحیت کے خلاف شرعی فتویٰ صادر کرتے ہوئے وطنِ عزیز کی حفاظت کی جدّوجُہد کو مقدس جہاد قرار دیا ہے، اور اعلان کیا ہے، کہ اس جہاد میں حصّہ لینا تمام پاکستانیوں پر فرض ہو گیا ہے" انہوں نے کہا "جب کوئی کافر قوم مسلمانوں پر حملہ آور ہوتی ہے تو اس وقت دفاعی جنگ میں شرکت سے گریز کرنا کفر کے مترادف ہے، لہٰذا قوم کے ہر فرد کو ملکی دفاع میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہیئے"[1]

جمعیۃ علماء اسلام ملک کی واحد دینی و سیاسی جماعت تھی، جس نے زبانی جمع خرچ کی بجائے قبائلی علاقہ سے ہزاروں رضاکاروں کی عملی پیشکش کی اور مالی تعاون اور ملک کی سالمیت کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کا اعلان کیا۔

سقوطِ ڈھاکہ

یحییٰ خان اندرونِ ملک "جہاد" سے فارغ ہوتا تو ہندوستان کے ساتھ جہاد کرتا

---

[1] روزنامہ "امروز" لاہور، ۲۹ نومبر ۱۹۷۱ء۔

نتیجتاً حالات پاکستان کے قابو سے باہر نکل گئے۔ ۳؍ دسمبر کو یحییٰ خاں نے مغربی محاذ کھولا مگر اب یہ اقدام بعد از وقت تھا، شکست اس کا مقدّر بن چکی تھی، یحییٰ خاں نے دونوں محاذوں پر شکست کی ذلّت سے اپنا دامن بچانے کے لئے مرکز میں فوری طور پر قومی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے اسّی سالہ واحد رکن اسمبلی مسٹر نور الامین کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ ۳۰۰ کے ہاؤس میں ۱۶۰ نشستیں لینے والا وزارتِ عظمیٰ سے محروم اور صرف ایک نشست کا مالک وزیر اعظم بنے، یہ پاکستان کے سوا بھلا اور کہاں ہو سکتا تھا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ قرار پائے۔ ۳؍ دسمبر سے ۱۷؍ دسمبر تک پاکستان اور اس کے سادہ لوح عوام کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی، مختصر یہ کہ مسٹر بھٹو نیویارک میں سقوطِ ڈھاکا کی خبر کا انتظار کرتے رہے۔ یحییٰ خاں یہاں جام لنڈھاتا رہا۔ ۱۶؍ دسمبر ۷۱ء ہماری تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے جب ڈھاکہ میں ہماری افواج نے ہندوستانی سپاہ کے سامنے سرنڈر (SURRENDER) کیا۔ اس شام یحییٰ خاں شراب کے نشے میں دھت "ریڈیو پاکستان" پر اعلان کر رہا تھا۔ "جنگ جاری ہے ہم دشمن سے برابر لڑتے رہیں گے" اور جب صبح لوگ "بیدار" ہوئے تو اخبارات کی شہ سرخیاں چیخ رہی تھیں "پاکستان نے جنگ بندی منظور کر لی" تاریخ نے سب حقائق اپنے دامن میں سمیٹ کر ورق پلٹ دیا۔ ۲۰؍ دسمبر کو یحییٰ خاں گئے اور مسٹر بھٹو آ گئے۔ وہ صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے آئے، جمہوری ملکوں میں پاکستان غالباً پہلا ملک ہے جہاں ایک عوامی نمائندے نے یہ "اعزاز" حاصل کیا۔

اس موقع پر مفتی صاحب نے مطالبہ کیا کہ "صدر یحییٰ، ان کے مشیروں اور ساتھیوں پر پاکستان کی سالمیت تباہ کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے، اور ایک

تحقیقاتی کونسل مقرر کر کے بھارتی فتوحات کی سازش کی تحقیقات کی جائے ، قوم یہ جاننے کا حق رکھتی ہے کہ آخر اس معمّے کا کیا مطلب ہے ، کہ پاکستان کی بہادر افواج نے ایک ہی رات میں دشمن کو اس کی سرحدوں میں دھکیل دیا۔ مگر اس کے بعد دس بارہ روز تک کوئی پیش قدمی نہیں کی گئی "[1]

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء

بارہواں باب

سقوط کے بعد

صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۰ر دسمبر کی رات ایک طویل تقریر کی اور قوم کو "نئے پاکستان" کی تعمیر کے لئے پکارا، مشرقی پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تسلیم کیا کہ "اس میں ہم سے کچھ غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں" فوج کی خبر لی اور چند جرنیل ریٹائر کرنے کا اعلان کیا۔ اپنے بارے میں کہا "مجھے غلط نہ سمجھئے میں کبھی انتقامی جذبے کے تحت کوئی اقدامات نہیں کروں گا" "کسی سیاسی لیڈر اور سیاسی پارٹی کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ان سے کوئی جانبدارانہ رویہ اختیار کریں گے۔ میں سب سے صلاح مشورے کروں گا"

اس کے ساتھ ہی نیشنل عوامی پارٹی سے پابندی ہٹانے کا اعلان کیا اور اس کے رہنماؤں سے درخواست کی کہ "وہ جلد سے جلد مجھے آ کر ملیں" مشرقی پاکستان میں کرائے گئے ضمنی انتخابات کو کالعدم قرار دیا۔ قوم سے وعدہ کیا کہ وہ جمہوریت کو بالفور بحال کریں گے "میں مارشل لاء کو جب تک اس کی ضرورت ہے اس کے بعد ایک دن، ایک منٹ، ایک سیکنڈ کے لئے بھی گوارا نہیں کروں گا" مسٹر بھٹو نے نہایت پُر زور انداز میں کہا۔

"ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے ہیں جن میں ایک آدمی بھی اُٹھ کر مجھ سے یہ کہہ سکے میں تمہیں نہیں مانتا، میں تمہیں پسند نہیں کرتا، تم جہنم میں جاؤ" وہ لوگ جنہیں مسٹر بھٹو کی نفسیات کا علم تھا۔ انہوں نے محسوس کیا۔ شاید مسٹر بھٹو کی ماہیت قلب ہو گئی ہے، چنانچہ مسٹر بھٹو کی اس تقریر کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا۔ تمام سیاسی جماعتوں نے باقی ماندہ ملک کو بچانے کے لئے اُن کی طرف دستِ تعاون بڑھا دیا۔ مولانا مفتی محمود نے اپنے ایک بیان میں عوامی نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی کو "نیک فال" قرار دیا۔[1]

اس دوران مسٹر بھٹو نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کی نمائندہ جماعتوں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیتہ علماء اسلام کے ساتھ عجیب و غریب طرزِ عمل اختیار کیا۔ ایک طرف اُن سے تعاون اور اقتدار میں شرکت کی درخواست کی۔ دوسری طرف اُن کے سروں پر اپنی پارٹی کے حامی گورنر مسلط کر دیئے۔ بہر حال ان جماعتوں نے اس تضاد کو مخصوص ملکی حالات کے پیش نظر کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور اُن کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ چنانچہ ۲۹ر دسمبر کو راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مفتی صاحب نے کہا:

"جمعیتہ نے مرکز، سرحد اور بلوچستان میں وزارتیں بنانے میں تعاون کرنے سے متعلق صدر بھٹو کی پیشکش قبول کر لی ہے" "جمعیتہ صدر بھٹو کے ان اقدامات کا خیر مقدم کرتی ہے جو پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور استحصال کے خاتمہ کے لئے کئے گئے ہیں" "ہم قومی سالمیت اور اتحاد کے استحکام اور اسلامی اصولوں کے مطابق ملک میں سماجی اور معاشی نظام قائم کرنے میں بھرپور تعاون کریں گے" اب جمعیتہ اور نیپ کے درمیان تعاون کا معاہدہ مزید مستحکم ہو گیا ہے۔ ہمیں اُمید

---

[1] روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۱ء

ہے کہ صدرِ مملکت صوبائی اسمبلیوں کا اجلاس بلائیں گے اور اُنہیں اُن کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں گی'' ، '' مارشل لاء جس قدر جلد ممکن ہو اٹھا لیا جائے تاکہ جمہوریت کے قیام کے لئے راہ ہموار ہو سکے[1]''

اس بیان کا مطلب تھا:

۱۔ تعاون کی بنیاد اسلام کے اصول ہوں گے،

۲۔ نیپ کے ساتھ جمعیتہ کا اتحاد ناقابلِ شکست ہے

۳۔ صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بُلا کر اُن کا کام اُن کے سپرد کیا جائے۔

۴۔ مارشل لاء جس قدر جلد ممکن ہو سکے ختم کیا جائے۔

مسٹر بھٹو نے جمعیتہ کے رہنماؤں کو یقین دلایا کہ صوبوں میں جمہوری حکومتیں جنوری ۷۲ء میں قائم کر دی جائیں گی۔ چنانچہ مولانا غلام غوث ہزاروی نے ۵؍ جنوری کو اس قسم کا ایک بیان بھی جاری کر دیا[2] ادھر جمعیتہ نے سرحد کے علاوہ بلوچستان میں بھی نیپ کے ساتھ باضابطہ سیاسی اتحاد کر لیا جس سے ان دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیتہ کی اکثریت قائم ہو گئی اور جمہوری طور پر یہ حکومت سازی کی حقدار بن گئیں۔ مسٹر بھٹو جو شاید نیپ اور جمعیتہ میں نفاق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ۲۲؍ جنوری کو لاڑکانہ میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس ۲۳؍ مارچ کو یعنی دو ماہ بعد بلائے جائیں گے۔ اس دوران بلدیاتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان نہ صرف غیر متوقع بلکہ خاصا عجیب بھی تھا۔ کیونکہ بلدیات کا محکمہ اور اس کے انتخابات اصولی طور پر صوبائی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرا مارشل لاء کے سائے میں بلدیاتی انتخابات کا کوئی جواز نہ تھا۔ مزید ستم یہ ہوا

---

[1] روزنامہ ''امروز'' لاہور۔ ۳۰؍ دسمبر ۱۹۷۱ء

[2] روزنامہ ''مشرق'' لاہور ۶؍ جنوری ۱۹۷۲ء

کہ مسٹر بھٹو نے اس پریس کانفرنس میں مارشل لاء کو ہٹانے یا اس سلسلہ میں کسی اقدام کا وعدہ کرنے کی بجائے اُلٹا صوبوں کے گورنر جو پیپلز پارٹی کے نامزد افراد تھے اور صوبوں کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے اُن کے مشیر مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔

نیپ اور جمعیتہ کے لیڈروں نے مسٹر بھٹو کی اس چال کو سمجھتے ہوئے مسٹر بھٹو کے اس بحالیٔ جمہوریت کے پروگرام کو مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے مارشل لاء کو ختم کیا جائے، پھر صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بُلا کر اکثریتی پارٹی کو اقتدار منتقل کر کے اُن کی زیرِ نگرانی بلدیاتی انتخابات منعقد کرائے جائیں۔ چنانچہ جمعیتہ علماء اسلام نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو لاہور میں اس قسم کا بیان جاری کر دیا۔[1] اس کے بعد حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ جانبین میں تلخی اور بدمزگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ ۲۰ فروری کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں خواتین کے انتخابات میں صدر بھٹو کے مقرر کردہ گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز مسٹر حیات محمد خان شیرپاؤ اور سردار غوث بخش رئیسانی نے نیپ اور جمعیت کے اسمبلی ارکان کو ترغیب و تحریص اور رشوت و لالچ کی جو پیش کشیں کیں وہ سابقہ حکومتوں کے تمام ریکارڈ مات کر گئیں۔ حکومت، بلوچستان میں جمعیتہ کے ایک رکن مولوی حسن شاہ کا ووٹ اپنے حق میں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ آج اِن مولوی صاحب کا حال دیدنی ہے، جمعیتہ کے ایک اور ممبر مولانا شمس الدین مرحوم حج بیت اللہ کے سلسلہ میں حجازِ مقدس گئے ہوئے تھے۔ حکومت نے اُن پر بھی ڈورے ڈالے۔ فوری آمد و رفت کے انتظام کا ذمہ اُٹھایا۔ مگر اس مردِ حق پرست نے صاف کہا، "اگر مجھے بلوچستان صرف انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے لئے لیجایا گیا

---

[1] "مفتی محمود کی سیاست" ص ۷۹ از قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ۔

نو ووٹ بہر صورت مولانا مفتی محمود کے حکم پر دوں گا۔" حکومت کو جب یقین ہو گیا۔ کہ مولانا شمس الدین کا ووٹ کسی صورت نہیں مل سکتا تو مولانا کو ایک روز کے لئے سعودی عرب سے بلوچستان لائے جانے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا[1]۔ اسی طرح کا کھیل سرحد میں بھی کھیلا گیا۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ خواتین کے انتخاب میں سرحد اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی نے قیوم لیگ اور دوسرے آزاد ارکان کے ساتھ مل کر نیپ اور جمعیتہ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ جب کہ سرحد اسمبلی میں نیپ اور جمعیتہ اور پیپلز پارٹی کے مابین آئندہ وزارت سازی کے لئے باہمی سمجھوتا ہو چکا تھا۔ مگر پیپلز پارٹی نے اس سہ فریقی سیاسی سمجھوتا کو نظر انداز کرتے ہوئے خواتین کی سیٹیں جیتنے کی خاطر قیوم لیگ سے مل کر محاذ بنا لیا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس کے باوجود پیپلز پارٹی اور قیوم لیگ دونوں ہار گئیں۔

سہ فریقی سمجھوتہ

اس شکست کے بعد مسٹر بھٹو نے اپنا پینترا تبدیل کیا۔ اور مارچ میں پھر مذاکرات کا ڈول ڈال دیا۔ نیپ اور جمعیتہ نے حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لئے مسٹر بھٹو کی دعوت قبول کر لی۔ ۴ر مارچ کو مذاکرات شروع ہو کر ۶ر مارچ تک جاری رہے، اس بات چیت میں نیپ کی طرف سے خان عبدالولی خاں، میر غوث بخش بزنجو، ارباب اسکندر خان، نواب خیر بخش مری۔ جمعیتہ علماء اسلام کی طرف سے مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے مسٹر بھٹو، مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی۔ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ، مولانا کوثر نیازی، رفیع رضا

---

[1] "مفتی محمود کی سیاست" ص ۷۹ از قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ۔

اور مسٹر حیات محمد خان شیرپاؤ شامل ہوئے۔ بالآخر ان سہ روزہ مذاکرات کے بعد ایک "تحریری سہ فریقی معاہدہ" وجود میں آیا۔ جس پر ۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو جمعیت، نیپ اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں مولانا مفتی محمود، خان عبدالولی خان اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دستخط ثبت کئے۔ اس معاہدے میں کہا گیا:

۱۔ یہ طے پایا کہ ارکان اسمبلی کو اجلاس میں شرکت کے دعوت نامے ۲۳ مارچ ۷۲ء کو جاری کئے جائیں اور قومی اسمبلی کا اجلاس ۱۴ اپریل ۷۲ء کو منعقد کیا جائے، جو تین دن سے زیادہ مدت تک جاری نہ رہے اور اس عرصہ میں مندرجہ ذیل پیرا نمبر ۲، ۳ اور ۴ میں بیان کئے گئے معاملات کے بارے میں رائے لی جائے گی،

۲۔ یہ طے پایا کہ ایک عبوری دستور ایکٹ ۳۵ء بشمول انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء مع لازمی ترمیمات کی بنیاد پر تیار کیا جائے گا، نیز یہ کہ تین دن سے زیادہ اس پر بحث نہیں ہوگی۔ جس میں صرف پارلیمانی لیڈر یا اُن کے نامزد کردہ افراد تقریر کریں گے،

۳۔ یہ طے پایا کہ اس اجلاس میں حکومت پر اعتماد کا ووٹ ہوگا۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء تک مارشل لاء جاری رکھنے کی منظوری دی جائے گی۔

۴۔ یہ طے پایا کہ دستور کی رپورٹ یکم اگست ۱۹۷۲ء تک پیش کی جائے۔ نیز یہ کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو دوبارہ منعقد کیا جائے۔

۵۔ یہ طے پایا کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کے بعد قومی اسمبلی مستقل دستور نافذ العمل ہونے تک دستور ساز ادارہ اور قانون ساز ادارہ دونوں حیثیت سے کام کرے، اس امر کا اعادہ کیا گیا کہ ہنگامی حالت ختم کرنے تک قانون کے تحت صدر مملکت کے اختیارات اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک ہنگامی حالت ختم ہونے کا اعلان نہ کر دیا جائے۔

۶۔ یہ طے پایا کہ صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس ۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء کو منعقد کئے جائیں،

۷۔ یہ بات منظور کر لی گئی کہ مرکز اور صوبوں دونوں میں حکومت پارلیمانی اکثریت کی بنیاد پر تشکیل دی جائے ۔

۸۔ یہ بھی منظور کر لیا گیا کہ جب تک نیا دستور نافذ العمل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک کوئی بھی شخص جو ایک سے زائد اسمبلی کا منتخب ممبر ہوگا اسے دونوں ایوانوں میں اپنی نشستیں برقرار رکھنے کی اجازت ہوگی۔ اور یہ اس وقت تک رہے گا جب تک دستور قطعی طور پر منظور نہیں کر لیا جاتا۔ اس طرح صدر، نائب صدر، گورنر، وزراء اور مرکز و صوبوں میں مشیروں کی متعلقہ اسمبلیوں میں نشستیں بھی برقرار رہیں گی،

۹۔ یہ طے پایا کہ جب تک قومی اسمبلی مستقل دستور کی تشکیل نہیں کرتی مرکزی حکومت کو ماضی کی طرح بدستور یہ حق حاصل رہنا چاہیئے کہ وہ صوبوں میں اپنے گورنر مقرر کر سکے۔ لیکن سمجھوتے کی غرض سے مرکزی حکومت اس عبوری عرصے کے دوران گورنروں کا تقرر مذکورہ صوبوں میں اکثریتی پارٹیوں کے مشورہ سے کرے گی ۔

۱۰۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور صوبہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیتہ علماء اسلام اکثریتی پارٹیاں ہیں اور وہ ان دو صوبوں میں حکومتیں بنانے کی مستحق ہونگی ۔

۱۱۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس منعقد ہونے کے بعد جہاں تک جلد ممکن ہو سکا۔ لوکل باڈیز کے انتخابات کی تاریخ مقرر کی جائے نیز یہ کہ تمام صوبوں میں انتخابات ایک ہی تاریخ کو ہوں۔ اس تجویز پر اتفاق ہو گیا اور صوبائی اسمبلیوں کا اجلاس شروع ہونے کے بعد جلد ہی کسی متفقہ تاریخ کو انتخابات منعقد ہوں گے ۔

۱۲۔ صدر نے یہ کہا کہ وہ آج یہ اعلان کریں گے کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو

مارشل لاء اٹھا لیا جائے گا۔

زیر دستخط مسٹر ذوالفقار علی بھٹو
صدر پاکستان و چیئرمین پی پی پی
دستخط ذوالفقار علی بھٹو

زیر دستخط خان عبدالولی خاں
صدر نیشنل عوامی پارٹی
دستخط خان عبدالولی خان

زیر دستخط مولانا مفتی محمودؒ
جنرل سیکرٹری جمعیتہ علماء اسلام
دستخط مولانا مفتی محمودؒ[1]

یہ معاہدہ پیپلز پارٹی کی محض سیاسی مجبوری تھا اور بس۔ البتہ نیپ اور جمعیتہ کو اس سے چند سیاسی فائدے ضرور حاصل ہو گئے۔ اور اس معاہدہ کی رُو سے ثابت ہو گیا کہ:

۱۔ مارشل لاء ملک کی سالمیت اور یکجہتی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ بلکہ مارشل لاء کی بدولت ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے۔

۲۔ مارشل لاء کی لعنت کو مکمل طور پر اٹھانے کے لئے پہلی مرتبہ ایک قطعی تاریخ کا تعین کیا گیا کہ ۱۴ اگست تک مکمل طور پر مارشل لاء کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگرچہ عملی طور پر اس کا خاتمہ ۲۱ اپریل کو ہونے والا تھا۔

۳۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کی قطعی تاریخ (۱۴ اپریل) کا اعلان کیا گیا۔

۴۔ ۲۰ فروری کو خواتین کی نشستوں کے انتخابات میں واضح شکست کھانے کے بعد پہلی مرتبہ نیپ اور جمعیتہ کی سرحد و بلوچستان میں اکثریت کو تسلیم کر کے دونوں جماعتوں کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لیا گیا۔

۵۔ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کے مقابلے میں سرحد اور بلوچستان

---

[1] روزنامہ "امروز" لاہور ۱۱ اپریل ۱۹۷۲ء

میں نیپ اور جمعیت کی حکومتوں کے قیام کے بعد فریقین برابری و مساوات کے مقام تک پہنچ گئے۔

۷۔ اس حقیقت کا واضح طور پر اعتراف کر لیا گیا کہ سیاسی مسائل بات چیت کے ذریعے ہی حل ہو سکتے ہیں۔

صدر بھٹو نے ۶ر مارچ ۷۲ء رات سوا آٹھ بجے "ریڈیو پاکستان" سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے اس سمجھوتے کی تفصیلات بیان کیں۔ اور واضح کیا کہ "چاروں صوبوں کی اسمبلیوں کا اجلاس ۲۱ر اپریل ۷۲ء کو طلب کر لیا گیا ہے[1]

ملک بھر میں اس معاہدے کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ اخبارات اور سیاسی رہنماؤں نے اس کی کھل کر ستائش کی لیکن بعد میں اس معاہدے کی ایک شق پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ نیپ اور جمعیتہ نے اس معاہدے کی شق نمبر ۳ کی یہ توجیہ کی

کہ یہ ایک طرح کا ایجنڈا ہے جسے تینوں جماعتیں قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرنے پر متفق ہوئی تھیں جبھی تو اس کی عبارت یوں تھی کہ " یہ طے پایا کہ اس اجلاس میں حکومت پر اعتماد کا ووٹ ہوگا اور ۱۴ر اگست ۷۲ء تک مارشل لاء جاری رکھنے کی منظوری دی جائے گی" اُن کا کہنا تھا کہ اس عبارت کا صاف لفظوں میں مفہوم یہی لیا جا سکتا ہے کہ ۱۴ر اگست تک مارشل لاء جاری رکھنے کی منظوری قومی اسمبلی سے لی جائے گی اور اسی طرح حکومت پر اعتماد کا ووٹ بھی قومی اسمبلی سے لیا جائے گا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ نیپ اور جمعیتہ نے حکومت پر اعتماد کا ووٹ پاس کر لیا ہے اور ۱۴ر اگست تک مارشل لاء جاری رکھنے کی منظوری دے دی ہے ——— بہرحال جب اس قضیے نے طول کھینچا تو نیپ

---

[1] روزنامہ "امروز" لاہور ۷ر مارچ ۱۹۷۲ء

اور جمعیتہ نے متنازعہ شق کی تشریح کے لئے سپریم کورٹ آف پاکستان کی طرف رجوع کرنے کی تجویز پیش کی ۔ اور بقول خان عبدالولی خاں" اس مسئلہ کو سپریم کورٹ میں پیش کرنے کا تصور خود صدر نے غوث بخش بزنجو کو پیش کیا تھا جب وہ انہیں کراچی ملے تھے" تعبیر و تشریح کے اس اختلاف کے باوجود ۴؍ اپریل ۷۲ء کو مولانا مفتی محمود نے صدر بھٹو کو اس مضمون کا تار دیا کہ "نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیتہ علماء اسلام الفاظ و معانی کے اعتبار سے سہ فریقی معاہدے پر قائم ہیں[1]" لیکن اس کے برعکس پیپلز پارٹی کی طرف مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے ۸؍ اپریل کو یہ اعلان کر دیا کہ "کہ اب یہ معاہدہ عملاً ٹوٹ چکا ہے[2]"، اور اس کی جگہ چھ متبادل نکات پیش کئے کہ ان پر معاہدہ ہو سکتا ہے، جنہیں نیپ اور جمعیتہ دونوں نے مسترد کر دیا۔ کیونکہ وہ ۶؍ مارچ والے معاہدے کی اپنے آپ کو پابند خیال کرتی تھیں، قطع نظر اس بات کے کہ اس بحث میں کون مبنی بر حق تھا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جب مارشل لاء ایک لعنت تھا۔ تو پھر ۱۴؍ اگست سے پیشتر اسے ہٹا دینے میں کیا حرج تھا؟ یار لوگوں نے مارشل لاء کا سر نہ توڑا، معاہدہ توڑ دیا۔

کشمکش

۶؍ مارچ کے معاہدے کی تنسیخ کے بعد نیپ، جمعیتہ اور پی پی پی کے درمیان پھر سے ٹھن گئی۔ ۵؍ اپریل کو جمعیتہ علماء اسلام کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس پشاور میں ہوا۔ جس میں مولانا مفتی محمود کو سرحد اسمبلی میں پارٹی کا پارلیمانی لیڈر نامزد کیا گیا۔ اس اجلاس میں جمعیتہ کے تمام ارکان قومی و صوبائی اسمبلی شریک ہوئے، مگر مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبدالحکیم نے شرکت نہ کی۔ مجلسِ شوریٰ نے

---

[1] روزنامہ "امروز"، لاہور ۱۱؍ اپریل ۱۹۷۲ء

[2] ایضاً

یہ تجویز بھی پاس کی کہ مولانا مفتی محمود کو نیپ و جمعیۃ کے اجلاس میں مشترکہ پارلیمانی لیڈر منتخب کیا جائے۔ چنانچہ ۷ر اپریل کو نیپ اور جمعیۃ کا مشترکہ پارلیمانی اجلاس ہوا جس میں خان عبدالولی خان نے مولانا مفتی محمود کا نام پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے تجویز کیا جس کی تائید ارباب اسکندر خان خلیل اور مسٹر امیرزادہ خان نے کی اور اس طرح نیپ اور جمعیۃ کے بائیس ارکان اسمبلی نے متفقہ طور پر مولانا مفتی محمودؒ کو اپنا پارلیمانی لیڈر تسلیم کر لیا۔

اُدھر پی پی پی اور قیوم لیگ نے آپس میں سمجھوتا کر لیا۔ ان دونوں جماعتوں نے اس غرض سے ازسرنو کوششیں شروع کر دیں۔ کہ کسی طرح نیپ اور جمعیۃ کے بعض ارکان توڑ کر اور بعض آزاد ارکان کو ساتھ ملا کر قیوم لیگ اور پی پی پی کی مخلوط حکومت قائم کر لی جائے۔

نیپ اور جمعیۃ نے اس صورتِ حال کا بڑی ہمّت اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ چنانچہ ولی خان نے نیپ کے سہ روزہ کنونشن کے اختتام پر ۹ر اپریل کو پشاور کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام میں ایک زبردست تقریر کی۔ انہوں نے اس جلسۂ عام میں صاف صاف کہہ دیا "صوبہ سرحد میں قانونی طور پر نیپ اور جمعیۃ کی حکومت ہے اور دونوں جماعتوں کی مخلوط پارلیمانی پارٹی کے قائد مولانا مفتی محمود صوبہ کے وزیر اعلیٰ ہیں"

"سرحد اور بلوچستان میں اکثریت کی بنیاد پر حکومت بنانے کا حق نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کو حاصل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حکومت ان صوبوں سے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل نیپ اور جمعیۃ کے ساتھ صلاح و مشورہ کرے۔"

۱۸ر اپریل کو مسٹر بھٹو نے خان عبدالقیوم خان کو جنہیں وہ ساڑھے چار ماہ پہلے

تک "گندی مخلوق" اور "پٹھانوں کا قاتل" تک کہتے رہے تھے۔ وزیر داخلہ کی حیثیت سے اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ یہ دراصل نیپ اور جمعیتہ کو ایک طرح کی وارننگ تھی کہ "اول تو تمہاری حکومتیں بننے ہی نہیں دوں گا اور اگر بن گئیں تو پھر خان عبدالقیوم خان تمہارے لئے بلائے جان ہو گا۔"

نیا معاہدہ

جب مسٹر بھٹو جمعیتہ اور نیپ کے ارکان توڑنے میں قطعی ناکام ہو گئے تو پھر مذاکرات کا سہارا لیا۔ ۲۲ر اپریل کو "پریذیڈنسی" میں مسٹر بھٹو، خان عبدالولی خاں اور مولانا مفتی محمود کے مابین ازسرِنو سیاسی مذاکرات ہوئے۔ جن کے نتیجہ میں ۲۷ر اپریل کو ایک نئے سہ فریقی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ جس کی رُو سے نیپ کے میر غوث بخش بزنجو اور ارباب اسکندر بالترتیب صوبہ بلوچستان اور سرحد کے گورنر قرار پائے۔ ۲۹ر اپریل ۷۲ء کو انہوں نے کراچی میں حلف اٹھایا۔ یکم مئی ۷۲ء کو مولانا مفتی محمود اور سردار عطاء اللہ مینگل نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے وزرائے اعلےٰ کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ اس طرح ۲۷ر اپریل کے معاہدے کی رُو سے ان دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیتہ کی مخلوط حکومتیں قائم ہو گئیں۔

عبوری آئین

مارشل لاء سے نجات پانے کے لئے عبوری آئین ۱۷ر اپریل ۱۹۷۲ء کو منظور ہوا اور ۲۱ر اپریل ۷۲ء کو نافذ کیا گیا۔ یہ ایک دلچسپ آئین تھا۔ جو نہ اسلامی تھا۔ نہ وفاقی اور نہ صدارتی۔ بلکہ اس کے مطابق مرکز میں صدارتی نظام رائج

کیا گیا اور صوبوں میں پارلیمانی۔ اس آئین کی بنیاد صرف اور صرف اقتدار کا تحفظ تھا۔ یہ آئین تمام چھوٹی پارلیمانی جماعتوں کو ایک دوراہے پر لے آیا۔ ایک طرف مارشل لاء تھا۔ دوسری طرف عبوری آئین۔ اُن کے لئے عبوری آئین اور مارشل لاء دونوں ہی قابلِ قبول نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے متفقہ طور پر یہ راہ نکالی کہ اس آئین کے تضادات و اسقام پر زبردست تنقید کی لیکن رائے شماری میں حصّہ نہ لیا۔ اس طرح عبوری آئین تو در آیا مگر مارشل لاء کے خنجرِ بُرّاں سے نجات مل گئی۔ اس موقع پر مولانا مفتی محمود نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

،، جنابِ صدر! آج جب کہ ہم اس ایوان میں جمع ہیں عبوری آئین پر بحث ہمارے لئے بڑی مشکل ہے، ہمارے لئے اس آئین کی ہر دفعہ کی حمایت بھی ناممکن ہے، اس لئے کہ دفعات میں بہت سی خامیاں ہیں اور اگر اس آئین کی مخالفت کریں تو اُدھر مارشل لاء کی تلوار بھی لٹک رہی ہے۔ اگر یہ آئین پاس ہوتا ہے تو مارشل لاء یہاں سے ہٹتا ہے اور نجات ملتی ہے۔ اگر پاس نہ ہوا تو نہ معلوم کتنی مدت اور بھی قائم رہنا ہے۔ بہر حال پھر بھی جو خامیاں ہمیں نظر آتی ہیں اُن کی نشاندہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

جنابِ صدر! ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کو بناتے وقت یہ نعرہ لگایا گیا تھا۔ کہ پاکستان کا مطلب لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ ہوگا۔ اور آپ بھی جانتے ہیں کہ ۲۴ ر سال تک حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اسلام کو سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کے نظریئے اور دین و مذہب کا تعلق ہے تو اس سے انحراف کی تمام کوششیں جاری ہیں، اس آئین میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے۔ مگر بہ نظرِ عمیق دیکھنے سے بھی اسلام کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے

آئینوں میں بھی اس کا نام یہی رکھا گیا تھا۔ مگر دوربین لگا کر بھی اس نظام میں اسلام کی کوئی بات دیکھ نہیں سکتے۔ جمہوریہ اس کو کہا گیا۔ مگر جمہوریت کی کوئی بات اس میں ہمیں نہیں مل سکتی۔ اور اب بھی ملک مارشل لاء کے تسلط میں چل رہا ہے[1]،،

اس کے بعد مفتی صاحب نے کئی اسقام اور فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی۔ کہ اس آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب نہیں قرار دیا گیا۔ بنیادی حقوق کے نام پر ارتداد کی چھٹی دی گئی ہے، خلاف اسلام عائلی قوانین کو تحفظ دیا گیا ہے، سرکاری ملازمین کو تحفظ نہیں، نظر بندی کے جابرانہ قوانین شاملِ آئین ہیں۔ وغیرہ۔

بہر حال رائے شماری کے وقت اپوزیشن نے متفقہ فیصلے کے مطابق اس میں حصہ نہ لیا اور اس طرح ۱۷ر اپریل ۱۹۷۲ء کو یہ آئین منظور کر لیا گیا۔ ۲۱ر اپریل کو اس کے نفاذ کے ساتھ ہی مارشل لاء ہٹا دیا گیا۔

---

[1] مولانا مفتی محمود کی قومی اسمبلی میں تقریر۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۷۲ء

تیرھواں باب

حمود الرحمٰن کمیشن کے رُوبرُو

۲۴ر دسمبر ۷۱ء کو مسٹر بھٹو نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے سلسلہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ اس شکست کے ”فوجی اسباب و وجوہ“ کی تحقیقات کرے۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کمیشن کا دائرہِ کار وسیع ہوتا اور وہ فوجی کے ساتھ سیاسی اسباب کی چھان بین بھی کرتا۔ کیونکہ واقعۃً اس سقوط کے اسباب فوجی سے زیادہ سیاسی تھے۔

حمود الرحمٰن کمیشن نے اس ضمن میں تمام سیاست دانوں کو طلب کیا اور باری باری اُن کے بیانات قلم بند کئے۔ مولانا مفتی محمود سے کمیشن نے پوچھا:

سوال: سقوطِ ڈھاکہ کی بنیادی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہو سکتی ہے ؟

جواب: میرے نزدیک سقوطِ ڈھاکہ یا بنگلہ دیش کے قیام کی بنیادی وجہ ۳ر مارچ کے قومی اسمبلی کے اجلاس کا التوا د تھا۔ اگر یحییٰ خان قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی نہ کرتا تو مشرقی پاکستان کبھی ہم سے جُدا نہ ہوتا۔ مشرقی پاکستان کے لیڈر اور

عوام دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے اجلاس کو بلا وجہ نہ بلائے جانے کی وجہ سے پہلے ہی شکوک و شبہات میں مبتلا تھے۔ اب جب اسمبلی کے اجلاس کی ایک قطعی تاریخ کا تعین کیا جا چکا تھا اور کئی ممبرانِ اسمبلی ڈھاکہ روانہ بھی ہو چکے تھے اچانک اجلاس کے التواء کا اعلان مشرقی پاکستان کے عوام پر بجلی بن کر گرا اور وہ اس غیر متوقع اعلان کو سُن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اس اعلان سے ان کا شک یقین کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ کہ پاکستان کی چوبیس سال کی تاریخ میں پہلی بار مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو جمہوری طریقے سے پاکستان پر حکومت کرنے کا موقع مل رہا تھا مگر انہیں اقتدار سے محروم رکھنے کی سازشیں کی جا رہی تھیں۔ گویا اُن پر اعتماد نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس قسم کی بد اعتمادی نے پہلے ہی مشرقی و مغربی پاکستان میں وسیع خلیج حائل کر دی تھی مگر اجلاس بُلا کر ملتوی کر دینے کے اقدام نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ گھروں سے باہر نکل آئے۔

سوال: یحییٰ خان کو ۳؍ مارچ کا اجلاس کیوں مُلتوی کرنا پڑا؟

جواب: اس سوال کے صحیح جواب کے لئے فروری ۷۱ء کے مہینے کی ابتدائی سیاسی سرگرمیوں کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہو گا۔ فروری کے پہلے ہفتے میں مسٹر بھٹو یحییٰ خان جب ملاقات ہوئی تو پانچ گھنٹے یہ مُلاقات جاری رہی، چنانچہ اس طویل ملاقات کے بعد مسٹر بھٹو نے ۱۲؍ فروری کو مجھ سے اور ولی خان سے پشاور میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مسٹر بھٹو نے شیخ مجیب کے "عزائم" سے ہمیں خبردار کیا۔ اور تجویز پیش کی کہ مغربی پاکستان کی تمام منتخب جماعتوں کو اس حصّے کے تحفّظ کے پیشِ نظر متحدہ اقدام کرنا چاہیئے اور ایک ہی آواز اٹھانی چاہیئے تاکہ شیخ مجیب کو "ٹھیک" کیا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ ابتدائی طور پر ہمیں ۳؍ مارچ کے قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دینا چاہیئے۔ تاکہ مجیب اپنی مرضی کا آئین ہم پر مسلط نہ کر سکے۔

مگر ہم نے جواب دیا کہ چونکہ عام انتخابات کے کافی عرصہ بعد قومی اسمبلی کا اجلاس بُلایا جا رہا ہے۔ اس لئے اب اسے ملتوی نہیں ہونا چاہیئے۔ نیز مشرقی پاکستان والے پہلے ہی شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔ کہ انہیں اکثریت حاصل کرنے کے باوجود جمہوری طور پر حکومت سازی کی دعوت نہیں دی جا رہی ہے اور اسمبلی کے اجلاس میں پہلے ہی غیر معمولی تاخیر ہو چکی ہے۔ اس لئے اب اجلاس بُلا کر ملتوی کرنا خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ باقی رہا شیخ مجیب کا چھ نکات کی بنیاد پر آئین مسلط کرنا تو ہم سب مغربی پاکستان کے مفادات کا تحفّظ کریں گے۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر جائیں گے۔ لیکن مسٹر بھٹو نے پشاور میں قیام کے دَوران ہی ۲ر مارچ کے اجلاس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی پیروی میں خان عبدالقیوم خان نے بھی ڈھاکہ جانے سے انکار کر دیا۔ انہیں ایام میں یحییٰ خان نے بھی تمام پارلیمانی لیڈروں سے مذاکرات کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا وہ سب لیڈروں پر زور دے رہا تھا۔ کہ ۳ر مارچ کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا جائے تاکہ وہ اجلاس ملتوی کرنے میں حق بجانب ثابت ہو سکے۔ لیکن مغربی پاکستان کی بعض سیاسی جماعتیں اس اجلاس کے بائیکاٹ کی کُھلّم کُھلاّ مخالفت کر رہی تھیں۔ اس صورتحال سے نپٹنے کے لئے یحییٰ خان نے ۲۰ر فروری کو مجھے اور مولانا ہزاروی کو ملاقات کے لئے طلب کیا۔ اور ہم پر زور دیا کہ ۳ر مارچ کے اجلاس میں شریک نہ ہوں۔ میں نے یحییٰ خاں سے کہا کہ اگر آپ اجلاس ملتوی کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں، ہم التوا اور اس کے بعد نتائج کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہیں جس پر یحییٰ خان نے کہا کہ اگر آپ لوگ اجلاس میں نہ جانے کا اعلان کر دیں تو مجھے اجلاس ملتوی کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ نیز اسمبلی کے اجلاس سے پہلے آئینی مسائل میں مفاہمت ضروری ہے۔ کیونکہ اجلاس بلانے کی صورت میں ایک سو بیس دن کی مقرّرہ میعاد کے اندر

آئین سازی کا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ تو اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان کرنا ہوگا۔ جس سے خزانۂ سرکار پر نو کروڑ روپے کا بوجھ آن پڑے گا۔ نیز اگر آئین مجیب کے چھ نکات کے مطابق بن گیا۔ تو اس سے ملک ٹوٹ جائے گا۔

میں نے یحییٰ خان کی باتیں سُن کر اس سے اختلاف کیا۔ اور کہا کہ بالفرض شیخ مجیب نے اسمبلی کے اندر ہماری بات نہ مانی اور چھ پوائنٹ پر اصرار کر کے آئین بنا لیا۔ تو ہمارے خیال کے مطابق ملک ٹوٹنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ کچھ عرصہ تک تو اکٹھا رہ سکے گا۔ لیکن اگر ۳ مارچ کا بُلایا ہوا اجلاس ملتوی کر دیا گیا تو یہ مُلک اسی سال دو ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔ علاوہ ازیں میں نے یحییٰ خاں سے یہ بھی کہا کہ جب آپ کو یہ خطرہ لاحق ہے۔ کہ شیخ مجیب اور مسٹر بھٹو میں باہمی مناقشت کی وجہ سے آئین ایک سو بیس دن کی مدت کے اندر نہیں بن سکے گا۔ تو آپ مقررّہ میعاد کے اندر توسیع بھی تو کر سکتے ہیں۔ اس سے وہ خطرہ ٹل جائے گا۔ جس کے تحت آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اسمبلی ٹوٹ جائے گی اور دوبارہ انتخابات کرانے پڑیں گے۔ اس لئے یا تو میعاد والی شرط ختم کر دیں یا اس میں توسیع کر دیں۔ لیکن قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہ کریں۔ مگر اس کا جواب یحییٰ خان کے پاس نہ تھا۔

سوال: جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یحییٰ خان ایک سو بیس دن والی شرط ختم نہیں کرتا۔ بلکہ اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا، اس سے آپ کے نزدیک شدید بحران پیدا ہونے کا خطرہ لاحق تھا تو کیا آپ نے مجیب سے مل کر اُسے نرم کرنے کی کوشش کی؟

جواب: جی ہاں! میں نے نہ صرف شیخ مجیب سے مل کر اس سے چھ پوائنٹ پر بحث کی بلکہ اُسے چھ نکات کے بارے میں اپنے اور دیگر جماعتوں کے نکتۂ نظر سے آگاہ کیا۔ شیخ مجیب سے بات چیت کی تجویز میں نے ازخود یحییٰ خان سے بوقتِ

ملاقات بیش کی تھی اور کہا تھا کہ آپ صبر کریں ہم مجیب سے بات کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں اور مولانا ہزاروی ۲۰ر فروری شام کو کراچی پہنچے تو ہوائی اڈہ پر رسول بخش تالپور، کوثر نیازی موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مسٹر بھٹو ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم مسٹر بھٹو کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمیں ۳ر مارچ والے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہ کرنے پر دوبارہ قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہم نہ مانے مسٹر بھٹو نے کہا کہ آپ صرف اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیں۔ باقی سب کو "ٹھیک" کرلوں گا۔

بہرحال ہم ۱۲ر فروری صبح براستہ کولمبو ڈھاکہ پہنچے۔ ہم نے مجیب سے دو گھنٹے تک گفتگو کی۔ اس نے کہا مجھے بھی ملک کی سالمیت کا احساس ہے۔ چھ نکات سے ملک دو ٹکڑے نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں میں مغربی پاکستان کے لیڈروں سے ان نکات پر بات چیت کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ اس قسم کا بیان اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ مگر یحییٰ خان اجلاس کے التواء کا پختہ پروگرام بنا چکا تھا چنانچہ مسٹر بھٹو نے ۲۸ر فروری کو منٹو پارک کے ایک جلسۂ عام میں اسمبلی کے بائیکاٹ کا اعلان کر کے پرانے موقف کو دہرایا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے مغربی پاکستان کے دوسرے لیڈروں کو بھی دھمکی دی کہ جو ڈھاکے جائے گا۔ وہ واپسی کا ٹکٹ لے کر نہ جائے۔ کیونکہ اسے کسی ہوائی اڈہ پر نہیں اترنے دیا جائے گا۔ اپنی پارٹی کے ممبروں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی ممبر اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اس تقریر کے بعد دوسرے روز یحییٰ خان نے ۳ر مارچ کے اسمبلی کے اجلاس کے التواء کا اعلان کر دیا۔ اس پر شیخ مجیب نے سارے مشرقی پاکستان کے حصہ میں عام ہڑتال کا اعلان کر دیا اور حالات ابتر ہوتے چلے گئے۔

اس دوران میں مسٹر بھٹو نے کراچی کے ایک جلسۂ عام میں دو اسمبلیوں اور دو

حکومتوں کا نظریہ پیش کرتے ہوئے "اِدھر ہم اُدھر تم" کا نعرہ لگایا۔ اس پر مغربی پاکستان کی بعض سیاسی جماعتوں (جمعیتہ و نیپ) نے کُھلم کُھلا اس قسم کے نظریات کی مخالفت کی کہ اس سے ملک دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

سوال: ڈھاکہ میں یحییٰ خان نے سیاسی لیڈروں سے جو مذاکرات کئے، کیا آپ اُن سے مطمئن تھے؟

جواب: میں ذاتی طور پر ڈھاکہ میں یحییٰ خان کے مذاکرات سے مطمئن نہیں تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ملاقات اس گول چکر سے ہو رہی تھی یعنی یحییٰ مجیب مذاکرات، یحییٰ بھٹو مذاکرات، بھٹو مجیب مذاکرات، یحییٰ، مجیب، بھٹو مذاکرات۔ درمیان میں کہیں کہیں مغربی پاکستان کے دوسرے لیڈروں سے یحییٰ کی بات چیت ہو جاتی یا ان لیڈروں سے کہا جاتا کہ وہ مجیب سے بات کریں۔ اقلیتی گروپ کے لیڈر جب مجیب سے بات کر کے یحییٰ خان سے ملتے اور اس سے کہتے کہ مجیب بالکل ٹھیک ہے اور اس نے مُلک کی سالمیت اور تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ تو یحییٰ خان کہتا کہ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مجیب چھ نکات سے کم پر بات نہیں کرتا۔ یحییٰ خان نے ان دس روزہ مذاکرات میں کبھی بھی تمام جماعتوں کے لیڈروں کو ایک میز پر بٹھا کر باہمی تبادلۂ خیال کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ ان ایام میں جب ہم مجیب اور یحییٰ خاں سے ملتے تو ہمیں ماحول کچھ پُراسرار سا معلوم ہوتا جیسے دریائی سطح بظاہر پُرسکون ہو مگر نچلی سطح پر تلاطم خیز موجیں باہم دست و گریباں ہوں۔ چونکہ ہمیں یحییٰ خان نے ڈھاکہ مذاکرات کے لئے ازخود بلایا تھا۔ لہذا قومی مفاد کے پیش نظر ہمارا جانا ضروری تھا۔ لیکن یحییٰ خان بظاہر پُرسکون ماحول پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ فوج اکٹھی کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ کارروائی کے وقت فوج کو اپنا راستہ ہموار کرنے میں کوئی دقت وغیرہ پیش نہ آئے۔

سوال: کیا ان دس روزہ مذاکرات میں یحییٰ خان کی طرف سے کوئی فارمولا بھی پیش

کیا گیا تھا جسے آپ لوگوں نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ایسے فارمولے کو تسلیم کرنے سے پاکستان دو ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا؟

جواب: جی ہاں! یحییٰ خان کی طرف سے ایک ایسا منصوبہ ہم اقلیتی پارٹی کے پارلیمانی لیڈروں کے سامنے رکھا گیا۔ جس کے متعلق یحییٰ خان نے خود کہا تھا کہ اس فارمولے پر مجیب اور وہ اتفاق کر چکے ہیں۔ اب آپ کی منظوری لینی باقی ہے۔ فارمولا یہ تھا:

(ا) ایک فرمان کے ذریعے صوبائی حکومتوں کا قیام عمل میں لایا جائے اور صوبائی اسمبلیوں کو کام کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

(ب) مارشل لاء اٹھا لیا جائے۔

(ج) مارشل لاء اٹھائے جانے کے بعد قومی اسمبلی کی دو کمیٹیاں قائم کر دی جائیں۔ یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان کے ممبران پر مشتمل دو علیحدہ کمیٹیاں جن میں مغربی پاکستان کے قومی اسمبلی کے ممبران کا اجلاس اسلام آباد میں بلایا جائے اور مشرقی پاکستان سے منسلک ممبرانِ قومی اسمبلی کا علیحدہ اجلاس ڈھاکہ میں طلب کر لیا جائے۔

(د) یہ دونوں کمیٹیاں دو الگ الگ دستور بنائیں۔ جب یہ دونوں کمیٹیاں دو دستور بنا لیں تو کُل پاکستان بنیادوں پر مشترکہ اجلاس بلایا جائے تاکہ کوئی متفقہ دستور تشکیل دیا جا سکے۔

اس فارمولے کو مسٹر بھٹو اور قیوم خان کے علاوہ مغربی پاکستان کے تمام لیڈروں نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا۔ کیونکہ اس فارمولے کو تسلیم کرنے کا مقصد ایک پاکستان کی بجائے دو پاکستان بنانے کی دستاویز پر دستخط کرنا تھا۔ اس فارمولے کے جواب میں مغربی پاکستان کے اقلیتی گروپ کے لیڈروں نے جو متبادل فارمولا پیش کیا۔ وہ

یہ تھا:

(ا) قومی اسمبلی کا اجلاس بُلایا جائے۔

(ب) قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں حلف وفاداری اٹھا لیا جائے۔

(ج) عبوری دستور کی منظوری کے بعد مارشل لاء اٹھا لیا جائے۔

ہمارے اس فارمولے سے مارشل لاء ہٹا لینے کے بعد مستقل آئین سازی تک درمیانی عرصہ میں کوئی خلاء پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ مارشل لاء کے ہٹائے جانے کے بعد اس کی جگہ عبوری دستور لے لیتا اور یوں نظامِ حکومت میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ بصورتِ دیگر اگر مارشل لاء قومی اسمبلی کے وجود میں آنے سے پہلے اور عبوری دستور کی منظوری سے قبل اٹھا لیا جاتا تو صدر جو مارشل لاء کے ذریعے صدر تھا۔ اس کے اختیارات خود بخود ختم ہو جاتے جس سے آئینی بُحران پیدا ہو جاتا۔ علاوہ ازیں یحییٰ خان کے فارمولے کے مطابق جب صوبائی اسمبلیاں جو صدر کے حکم سے مارشل لاء کی موجودگی میں معرضِ وجود میں آ چکی ہوتیں۔ وہ اگر اپنی آزادی یا خود مختاری کا کوئی قانون منظور کر لیتیں تو وہ مکمل آزاد ہو سکتی تھیں۔ گویا یحییٰ خان کے اس فارمولے کے تحت ایک پاکستان کی جگہ کئی خود مختار پاکستان بنانے کی سازش کارفرما تھی۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو آئینی تحفظ دینے کی سازش پروان چڑھ چکی تھی، یہی وجہ تھی۔ کہ اس فارمولے کو سُننے اور تسلیم کر لینے کے بعد شیخ مجیب ٹیگور کے شعر گنگنانے لگے تھے۔ یحییٰ خاں نے جب دیکھا۔ کہ ہم نے اس کے پیش کردہ فارمولے کو مسترد کر دیا ہے۔ تو کہنے لگا۔ کہ اُس نے مجیب سے کہہ رکھا تھا۔ کہ اس فارمولے پر اس وقت عملدرآمد کیا جائے گا۔ جب مغربی پاکستان کے تمام لیڈر اِسے تسلیم کر لیں گے۔

سوال: کیا آپ نے شیخ مجیب سے یحییٰ خان اور اپنے پیش کردہ دونوں فارمولوں پر بات چیت کی اور اس کا ردِعمل معلوم کیا؟

جواب: ہم اقلیتی پارلیمانی گروپوں کے لیڈر ۲۳ر مارچ کو شیخ مجیب سے ملے۔ اور اس سے یحییٰ خان کے فارمولے پر بات چیت کی اور اُسے بتایا کہ اس فارمولے میں بہت سے خطرات موجود ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اس فارمولے کی بنیاد پر ملک کئی حصّوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ ہمارے فارمولے پر غور کریں۔ لیکن مجیب یحییٰ خاں کے فارمولے پر مُصر رہا۔ ہم نے یہ رپورٹ یحییٰ خان کو دی۔ یحییٰ خاں نے کہا کہ میں نے دو اسمبلیوں کی اسکیم آپ کی رضامندی سے مشروط کر کے تسلیم کی تھی لیکن جب آپ اس فارمولے کو ملکی سالمیت اور بقاء کے لئے مُضر سمجھتے ہیں تو اب میں اسے تسلیم نہیں کروں گا۔ اور مجیب پر زور دوں گا۔ کہ وہ بھی اسے تسلیم کرے۔ لیکن دوسرے روز ہم یحییٰ خان سے ملے تو اُس نے کہا کہ مجھے فوجی اقدام کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مجیب نہیں مانتا۔ ہم نے کہا کہ ہم جمہوری آدمی ہیں۔ مارشل لاء لگانے یا فوجی اقدام کے لئے آپ اپنے جرنیلوں سے مشورہ کریں۔ ہم اس سلسلہ میں کسی قسم کا کوئی مشورہ نہیں دیتے۔ اس پر یحییٰ خاں بولے کہ اچھا آپ چلے جائیں۔ ہم ۲۴ر مارچ کو واپس آگئے۔ یحییٰ خان نے ۲۵ر مارچ کو فوجی اقدام کیا۔ مغربی پاکستان کے لیڈروں میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے خیر مقدم کیا۔ اور اعلان کیا کہ اس فوجی اقدام نے پاکستان کو ٹکڑے ہونے سے بچا لیا ہے۔ جبکہ ملک کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ مسٹر بھٹو کا فرمان غلط تھا۔ کیونکہ فوجی اقدام ملک بچانے کی بجائے ملک کو دو ٹکڑے کر دینے کا باعث بنا اور قائدِ اعظمؒ کے پُرانے پاکستان کی جگہ قائدِ عوام کا نیا پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔"[1]

---

[1] "مفتی محمود کی سیاست"، ص ۱۱۵ تا ۱۲۴ از قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ۔

چودھواں باب

درویش وزیرِ اعلیٰ

مولانا مفتی محمود نے یکم مئی ۱۹۷۲ء کو صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ پاکستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے یہ پہلا خوشگوار تجربہ تھا کہ ایک صوبے کی حد تک ہی سہی، اقتدار ایک عالمِ دین کو ملا۔ اور اس عالمِ دین نے قوم کو مایوس نہ کیا۔ مولانا مفتی محمود نے اس خیال کو باطل ثابت کر دکھایا کہ علماء حکومت کی نہیں، مسجد کی چیز ہیں۔ انہوں نے ساڑھے نو ماہ کی مختصر مدت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے منشور پر عمل درآمد کیا۔ ان کے اقدامات اس قدر مؤثر، تعمیری اور زوردار تھے کہ ملک بھر میں ان کی صدائے بازگشت سنی گئی اور قوم ان کے لئے سراپا تحسین بن گئی۔

ذیل میں ان کی خدمات کا سرسری تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شراب پر پابندی

مولانا مفتی محمود نے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھاتے ہی سب

سے پہلا جو حکم جاری کیا، وہ امتناعِ شراب کا تھا۔ شراب بنانے، پینے، رکھنے اور بیچنے پر پابندی عائد کر دی ـــــ ظاہر ہے جو چیزیں اسلام میں حرام یا ممنوع ہوں انہیں باقی رکھنا معاشرے میں فساد برپا کرنے اور اس فساد کو پرورش کرنے کے مترادف ہے۔ ـــــ مفتی صاحب جانتے تھے اس اقدام کی زد کہاں کہاں اور کس کس پر پڑے گی، انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ شراب کی بندش سے صوبہ سرحد کو ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کی ایکسائز ڈیوٹی کا خسارہ ہو گا، مگر مفتی صاحب نے ان تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر ”اِنَّ اللّٰہ“ کی ضرب لگا دی۔ اور صوبہ سرحد میں شراب کا مٹکا ٹوٹ گیا۔ مفتی صاحب کے اس اقدام کا نہ صرف پورے ملک میں والہانہ خیر مقدم کیا گیا۔ بلکہ پورے عالمِ اسلام میں مسرت و انبساط کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لیبیا کے صدر کرنل معمر القذافی نے پیغام بھیجا ”شراب پر پابندی کے بارے میں میں آپ کے جرأت مندانہ اقدام پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اسلامی اقدار کے احیاء اور سربلندی کے لئے آپ کی کوشش قابلِ تحسین ہیں[1]“ مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ عبدالعزیز بن باز ؟) نے کہا ”پورے عرب میں آپ کی اسلام دوستی اور حب الوطنی پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسلامی اصلاحات کے اجراء سے قرآنی حکومت کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔ ہم آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں[1]“ ملک بھر کے اخبارات نے اداریے لکھے، سیاسی و دینی شخصیتوں نے اظہارِ تحسین کے لئے بیانات جاری کیے۔

سرکاری زبان اُردو

قائداعظمؒ نے فرمایا تھا: ”اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی

---

[1] ”مفتی محمود کی سیاست“ ص ۳ :: قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ۔

راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ میری رائے میں اُردو اور صرف اُردو ہے[1]"

— مفتی محمود صاحب کا دوسرا بڑا اقدام اس اُردو زبان کو صوبے کی سرکاری زبان قرار دینا تھا — یہ اس کے باوجود تھا کہ صوبہ سرحد کی اکثریت پشتو بولنے والوں کی تھی۔ دوسرا جمعیتہ کی حلیف نیپ تھی۔ جس کے بارے میں آج تک یہی پروپگنڈا کیا جاتا ہے کہ وہ پختونستان کی حامی اور کٹّر صوبہ پرست ہے۔ اس کے برعکس صوبہ سندھ میں مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی نے سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان قرار دلوایا۔ اس موقع پر جو کشت و خون ہوا اور اردو بولنے والوں کو جس طرح کچلا گیا وہ مسٹر بھٹو کے دورِ حکومت کا سیاہ ترین باب ہے۔

سرکاری لباس

آزاد قوموں کی ہر ادا اپنی ہوتی ہے وہ اپنی روایات و اقدار پر جی جان سے فدا ہوتیں اور ہر میدان میں سر اونچا کر کے چلتی ہیں۔ احساسِ کمتری نام کی کوئی چیز اُن میں نہیں پائی جاتی۔ ہمارے جسم اگرچہ آزاد ہو گئے مگر ذہن بدستور غلام رہے اور ہیں۔ "صاحب" بن کر رہنا اور "صاحبوں" ہی کی عزّت کرنا ہماری فطرت میں کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ہم آج تک اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ مفتی صاحب نے اس غلامانہ ذہنیت پر بھی ضربِ کاری لگائی اور صوبہ سرحد کا سرکاری لباس شلوار قمیص قرار دے دیا کہ تمام گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ افسر یہی لباس پہنا کریں — نتیجتہً ہر طرف شلوار قمیص کی حکومت ہو گئی۔ اور یہ گویا سچے جمہوری

---

[1] ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب۔ ۲۴ر مارچ ۱۹۴۸ء

دَور کا آغاز تھا۔

جہیز ایکٹ

معلوم ہوتا ہے۔ جہیز کی رسم کا آغاز بھلے وقتوں میں ہوا تھا مگر باور کیجئے فی زمانا "جہیز" "تجہیز" کا ہم معنیٰ ہو کر رہ گیا ہے —— اس روگ نے ہماری معاشرت کو جس طرح کنگال اور بیٹیوں کو بے سوا بنایا ہے۔ وہ ہماری سوسائٹی کا ایک رِستا ہوا ناسُور ہے —— مفتی صاحب نے اس کے سدِّباب کے لئے سرتوڑ کوشش کی۔ آپ نے جس طرح دیگر برائیوں کے انسداد کے لئے قانون بنوائے۔ وہاں "جہیز آرڈی ننس" نافذ کر کے اس خرابی کا بھی محاسبہ کیا۔ اس آرڈیننس نے مُلک بھر میں جو لہریں پیدا کیں۔ انہی کا نتیجہ تھا۔ جو بعد میں مرکزی حکومت نے بھی ایک جہیز آرڈی ننس منظور کیا۔

جوئے پر پابندی

شراب اور جُوا انسانی سوسائیٹی کے لئے سرطان (کینسر) سے کم نہیں۔ تمام برائیوں کو یکجا کیجئے، اُن کے نقصانات، شراب اور جُوئے کے مضرات سے کہیں کم نکلیں گے —— اسلام کے کسی بڑے سے بڑے دشمن مورخ یا مستشرق کو پڑھ لیجئے اس باب میں آپ سب کو متفق پائیں گے کہ شراب اور جُوئے ایسی قباحتوں کا جس کامیابی کے ساتھ احتساب اسلام نے کیا اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اسے ہماری بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس مُلک میں تیس سال تک شراب بھی کُھلے بندوں بکتی رہی اور جُوا بھی ہوتا رہا —— یہ اعزاز بھی قدرت نے مولانا مُفتی محمود ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ جنہوں نے "انگور کی بیٹی" کے ساتھ "ہوس کے بیٹے"

کو بھی پابۂ زنجیر کر دیا۔ اور ہر نوع کا جوا صوبہ سرحد کی حد تک قانوناً جرم قرار پا گیا۔

تعلیمی اصلاحات

نظامِ تعلیم کا مسئلہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ افسوس آج تک ہمارے رہبروں نے اس طرف توجہ نہ کی۔ یاد رکھیئے محض فیسیں معاف کر دینے یا کتابیں مفت بانٹنے سے بات نہ بنے گی۔ نظام بدلئے نظام "علم" سے زیادہ "العلم" کو رائج کرنیکی کوشش کیجئے۔ جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"طَلَبَ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ" کہ العلم (یعنی قرآن، حدیث اور فقہ کا علم) حاصل کرنا ہر مرد و زن پر فرض ہے —— کیا دنیا مفتی محمود کو مرحبا نہ کہے گی۔ جنہوں نے اپنے محدود اختیارات کے باوجود اس شعبہ میں بھی دور رس نتائج کے حامل اقدامات کئے اور پاکستان میں پہلی بار ایک صوبہ کی حد تک ایک مردِ درویش کی معرفت اتنا تو ہوا کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ کے لئے قرآن کریم ناظرہ پڑھا ہوا ہونا اور ترجمہ کے ساتھ نماز کا یاد ہونا ضروری قرار دیا گیا —— ہر دانا و بینا انسان اس اقدام کے فوائد و اثرات کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب نے صوبے میں تعلیم عام کرنے اور تعلیمی سہولتوں میں اضافے کے لئے ایک جامع منصوبے پر عمل درآمد کرایا۔ ایک سو اٹھارہ پرائمری سکولوں کی نیو اٹھوائی۔ نوّے سے زائد اسکول پرائمری سے مڈل اور مڈل سے ہائی ہو گئے۔ دس نئے ہائی اسکول منظور کئے کرک میں ایک نیا انٹرمیڈیٹ کالج، ہری پور اور لکی میں ڈگری کالج اور کوہاٹ میں لڑکیوں کے لئے ایک نیا انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے کالج میں مزید چار مضامین میں ایم اے کلاسز شروع کی گئیں۔ پشاور یونیورسٹی میں ایک مرکزِ تخصص قائم کیا۔ جس میں بیالوجی کے مضمون کے متعلق ریسرچ، عملی تجربہ، تعلیم و تربیت اور دیگر

سہولتوں میں اضافے کا انتظام کیا۔ تاکہ اس میدان میں صوبے کو زیادہ سے زیادہ ماہرین مہیا ہو سکیں۔ اور آگے چل کر صوبے کی معدنی دولت سے بہتر طور پر استفادہ کیا جا سکے غریب نادار اور ذہین طلبہ کے لئے تیئس لاکھ روپے کے وظائف منظور کئے۔ نژادِ نَو کو قرآنی تعلیم بہرہ مند کرنے کے لئے صوبہ کے ۱۹۱ اسکولوں میں علومِ دینیّہ کے ماہر قُرّاء اور فاضل علماء کے تقرّر کا اعلان کیا۔ دیکھا آپ نے؟ کام کرنے والے اس طرح کام کرتے ہیں،

پردہ

عورت کو "اِسلام" کی حکومت سے بے وجہ نہیں ڈرایا جاتا۔ ڈرانے والے اپنی جگہ پر سچّے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اسلام ہیئتِ مقتدرہ قرار پا جائے تو ان ہوس پرستوں کے اللوں تللوں اور عیاشیوں کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ——— عورت جتنی بھولی مخلوق بھلا دنیا میں کہاں ہو گی، یہ جانتے بوجھتے فریب کھا جاتی ہے۔ اِسی لئے شاید اقبال نے کہا تھا ؎

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پُرانی
نسوانیتِ زن کا محافظ ہے فقط مرد

مگر اس دَور کا مرد، "مرد" کم اور "خواجہ سرا" زیادہ ہے۔ اس لئے جو مرد ہیں۔ اُن کی ذمّہ داری بڑھ گئی ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے دورِ وزارت میں اس پہلو پر بھی توجہ کی ——— مرد و زن کے کُھلے موجودہ اختلاط اور عورتوں کی سرِ بازار بے حجابی سے پرورش پانے والی خرابیاں کس دردمند انسان کو سوچنے پر مجبور نہ کرتی ہوں گی؟ ——— مفتی صاحب کو خدا نے اقتدار دیا تو انہوں نے خواتین کے لئے پردے کا اہتمام ضروری قرار دیکر اپنی نیکیوں کی فہرست میں مزید اضافہ کر لیا۔

احترامِ رمضان آرڈیننس

ہماری قوم بڑی دلچسپ ہے، یہ اسلام کے نفاذ کی توقع اُن سے کرتی ہے جو اپنے ساڑھے پانچ فٹ کے قد پر اسلام نافذ نہیں کرسکتے۔ ——— یاد رکھیئے اسلام وہی نافذ کرسکتا ہے۔ جو خوفِ خدا سے ڈرتا اور اسلام پر چلتا ہے۔

مفتی محمود صاحب کی مثال سامنے ہے۔ اپنے محدود اختیارات کے باوجود انہوں نے اسلام کی جو خدمت کی۔ ہمیشہ یاد رہے گی۔ صوبہ سرحد میں احترامِ رمضان کا آرڈیننس نافذ کرکے انہوں نے اسلام کا بول بالا کیا۔ صوبہ سرحد کے تمام ہوٹل رمضان کے مقدس و محترم مہینہ میں بند رکھنے کا حکم صادر ہوا۔ اور خلاف ورزی کی سزا ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور دو ماہ کی قید یا ایک ہی وقت میں دونوں ——— نتیجتاً صوبہ سرحد کے تمام ہوٹل مہینہ بھر کے لئے بند ہوگئے۔ اور روزہ خوار غائب غلّہ!

سود کی بندش

مفتی صاحب نے مُلکی معیشت کو اسلامی خطوط کی راہ پر لگانے کیلئے صوبہ سرحد میں پچھلے تقاوی قرضوں پر سود معاف کردیا اور آئندہ بلاسود تقاوی قرضے جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس اعلان سے صوبہ سرحد کے زمینداروں نے سُکھ کا سانس لیا۔ کیونکہ تقاوی قرضوں پر دوگنے قرضوں نے اُن کی کمر توڑ رکھی تھی ——— اے کاش مرکزی سطح پر بلاسود معیشت کا نظام رائج ہوسکے!

تعطیلِ جُمعہ کی سفارش

اسرائیل کا یہودی ہفتہ (سبت) کو چھٹی کرتا ہے۔ کہ یہ اس کا مقدس دن ہے۔ عیسائی اتوار کو چھٹی کرتا ہے کہ یہ اس کے گرجا جانے کا دن ہے۔ ہم برِصغیر میں انگریزوں کی آمد سے پیشتر جمعہ کو چھٹی کرتے تھے کہ یہ ہمارا مذہبی دن ہے۔ انگریز نے آکر جمعہ کی چھٹی کو اتوار کی چھٹی میں مُنقلب کیا۔ اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا کہ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ الخ کا تقاضا یہی تھا۔ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو انگریز یہاں سے چلا گیا۔ ہم آزاد ہو گئے۔ ہمیں لازم تھا کہ ہم دَورِ غلامی کے تمام نشانات مٹا ڈالتے۔ اتوار کی چھٹی منسوخ اور جمعہ کی چھٹی کا فوری اجراء ہوتا مگر۔

ع یک حرف کاشکے بصد جا نوشتہ ایم

مفتی صاحب نے جب اقتدار سنبھالا تو یہ بِل پاس کرایا کہ صوبہ سرحد میں تعطیل اتوار کی بجائے جمعہ کو کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ بھلا مرکزی حکومت کو یہ بات کیسے اچھی لگتی۔ اس کے ذمہ داروں نے وہ مخالفت کی کہ بس توبہ ہی بھلی ـــــ آج اگر جمعہ ہی یومِ تعطیل قرار پایا ہے تو اس کے محرکات: عوامل ظاہر ہیں۔

اِسلامی قوانین بورڈ

اسلام کے نام پر ہمارا یہ خوبصورت اور پیارا سا مُلک ہمیں مِلا۔ مگر ہم نے اسلام کے ساتھ برادرانِ یوسف کا سا سلوک کیا۔ محاورۃً بھی اور حقیقتاً بھی۔ اور بالفاظِ شاعر

ع ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

مفتی صاحب اس ضمن میں بڑے عزائم رکھتے تھے۔ (اور رکھتے ہیں) انہوں نے اسلامی قوانین کی تشکیل کی غرض سے علماء اور ماہرینِ قانون کا ایک بورڈ بھی مقرر کیا۔ جسے صوبہ سرحد میں نافذ قوانین کو کتاب و سنّت کی کسوٹی کر پرکھنے اور صوبہ سرحد میں اسلامی قوانین کو رائج کرنے کے لئے ایک جامع رپورٹ پیش کرنے کا کہا گیا۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ کیونکہ مرکز کی طرف سے "قانون سازی" کے لئے صوبائی حکومت کو کوئی مؤثر اختیارات حاصل نہ تھے۔

سرسری جائزہ

مفتی صاحب نے صوبہ سرحد میں کوئی ساڑھے نو ماہ حکومت کی ——

ایک صوبائی حکومت کے اختیارات کیا ہوتے ہیں؟ بہر حال دنیا نے محسوس کیا کہ ملک کی بھاگ ڈور اگر بوریہ نشینوں کے ہاتھ میں ہو تو بات بن سکتی ہے۔ اور جب مفتی صاحب اقتدار سے دست کش ہوئے تو اُن سے سخت اختلاف رکھنے والوں نے بھی کہا۔ "مفتی صاحب کی وزارت پر ذاتی منفعت کا کوئی داغ نہیں[1]"

مفتی صاحب کی خدمات اس وقت اور زیادہ وقیع اور قابلِ قدر ہو جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ

(۱) اُنہیں ناکام بنانے کے لئے مرکزی حکومت اور اُس کے وُزراء مثلاً عبدالحفیظ پیرزادہ، معراج محمد خان، کوثر نیازی اور خورشید حسن میر وغیرہ اکثر و بیشتر صوبہ سرحد کے دوروں پر رہتے اور مفتی صاحب کے خلاف مختلف النوع الاؤ

---

[1] ہفت روزہ "چٹان" لاہور ۵ مارچ ۱۹۷۳ء۔

بھڑک رہے تھے۔

(ب) اُن لوگوں کی سرگرمیاں جو اپنے اقتدار کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر اُن کا خواب خواب ہی رہا اور اقتدار جمعیتہ اور نیپ کو منتقل ہو گیا۔ اور اب وہ انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔

(ج) افسروں کی وہ جماعت جو انگریز کی بیٹی سے پیار کرتی اور اپنے تئیں علماء کو مسجد کی چیز سمجھتی تھی۔ ظاہر ہے یہ لوگ دیسی یا بدیسی انگریزوں کی ماتحتی کر سکتے تھے کسی مردِ درویش کی نہیں مرکزی حکومت کی مفتی محمود دشمنی نے ان کو اور شیر کر دیا تھا۔

(د) قادیانی جماعت کی مُلک بھر میں مفتی صاحب کے خلاف کھُسر پھُسر ایک اطلاع کے مطابق صوبہ سرحد میں بالخصوص اس جماعت نے اس غرض سے اپنے سیل (Cells) تک قائم کئے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود مفتی صاحب کے دورِ وزارت میں نہ تو ایک دن کے لیے کہیں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہوا، نہ کہیں گولی اور آنسو گیس چلی، نہ کسی اخبار کا ڈیکلریشن ضبط ہوا اور نہ ہی سیاسی وجوہ پر کسی کی گرفتاری عمل میں آئی۔

وزیری میں فقیری

مولانا مفتی محمود جب ۷۲ء میں صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلےٰ بنے تو انہوں نے وزیری میں فقیری کی ریت کو تازہ کیا۔ وزیرِ اعلےٰ کی حیثیت سے چار ہزار روپے کرایہ پر حاصل کئے گئے۔ بنگلہ میں رہنے سے، جس کا صرف صفائی کا خرچ ایکہزار روپے ماہوار تھا۔ محض اس لئے انکار کر دیا کہ ایک غریب صوبے کے وزیرِ اعلےٰ کو یہ

زیب نہیں دیتا[1]۔ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے نصف تنخواہ لینا منظور کی۔ جس کا اتباع اُن کے وزراء نے بھی کیا۔ نتیجۃً صوبے کی معیشت پر نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ ساڑھے نو ماہ کے عرصۂ وزارت میں اُن کے درویشانہ اندازِ زندگی اور طبعی فقر و استغناء میں ذرا سا فرق بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جو سادگی اور درویشی وزیر اعلیٰ بننے سے پہلے تھی وہی نقشہ بعد میں رہا۔

روزنامہ "حریت" کے اشرف ہاشمی لکھتے ہیں: "میں ۲ رمئی کی شب (یعنی مفتی صاحب کے حلف اٹھانے سے اگلے روز) نو بجے پشاور کے سرکٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ دسترخوان پر بیٹھنے کو میں نے محاورۃً استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس سے حقیقتِ حال کا اظہار مقصود ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے ایک کمرے کے فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان نے اُسے ڈائننگ روم بنا دیا تھا۔ اور کھانے کا اہتمام یوں تھا نہ تو چوبداروں کا ہجوم تھا اور نہ باوردی بیروں اور خانساماؤں کی بھاگ دوڑ۔ جمعیتہ کے کچھ کارکن میزبان بنے ہوئے تھے۔ اس ڈنر پر نہ تو صوبے کا کوئی صنعت کار مدعو تھا اور نہ کوئی دوسرا "صاحبِ فن"۔ لے دے کے ایک مولانا عبدالحکیم ایم این اے تھے جو اپنے ٹخنوں تک کرتے اور طویل حدودِ اربعہ کی بدولت لاکھوں میں ایک ہیں۔ اور دُور سے پہچانے جاتے ہیں۔"

"کھانے سے فراغت کے بعد جب مولانا نمازِ عشاء ادا کر چکے تو میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ شب خوابی کے اس کمرے میں چٹائی کی جائے نماز، دو کرسیاں اور ایک ایسا صوفہ سیٹ پڑا ہوا تھا۔ جو غالباً اب اپنی عمرِ طبعی کو

---

[1] روزنامہ "حریت" کراچی کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو، ۱۵ رمئی ۱۹۷۲ء

پہنچ چکا ہے۔ اس کمرے میں مجھے پاکستان کے اس انتہائی اہم صوبے کے غیر متوقع وزیرِ اعلیٰ سے ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔[1]

قصۂ محمود و ایاز

کراچی کا ایک اور اخبار نویس مولانا مفتی محمود سے ملاقات کیلئے یکم جولائی ۱۹۷۲ء کو اُن کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ اُس کو بتایا گیا کہ مفتی صاحب چند وزراء کیساتھ اہم امور پر "تبادلۂ خیال" کر رہے ہیں۔ ملاقات کے لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ اسی اثناء میں مغرب کی اذان ہوئی اور باہر لان میں نماز کا انتظام ہونے لگا۔ اخبار نویس لکھتا ہے "اب مجھے سو فیصدی اُمید ہو گئی کہ مفتی صاحب ضرور باہر آسکیں گے۔ اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انٹرویو کا وقت مقرر کر لوں گا، چند ہی لمحوں بعد صوبائی وزیرِ اطلاعات اور دوسرے لوگ کھڑے تھے مجھے بھی پہلی بار یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وزیرِ اعلیٰ کی رہائش گاہ پر اُن ہی کی امامت میں نماز پڑھی۔ آج اس شعر کی عملی تصویر میرے سامنے تھی۔

ع ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز[2]"

ایک یاد

اکتوبر ۱۹۷۲ء کی ایک رات کا ذکر ہے۔ پشاور کے ایک یورپی طرز کے ہوٹل میں عالمی ادارۂ خوراک کے ڈائریکٹر مسٹر اکینو کے اعزاز میں عشائیہ تھا جب

---

[1] روزنامہ "حریت" کراچی ۱۵؍ مئی ۱۹۷۲ء

[2] ہفت روزہ "پیمان" کراچی کو مفتی محمود کا انٹرویو ۲۴؍ جولائی ۱۹۷۲ء

ضیافت شروع ہوئی تو مولانا مفتی محمود اور صوبہ سرحد کے گورنر ارباب اسکندر خان خلیل نے اپنے اور مہمانوں کے ڈرائیوروں کو بھی ضیافت میں مدعو کر لیا۔ اس طرح مہمان خصوصی، گورنر، وزیر اعلیٰ، دوسرے اعلیٰ حکام اور ڈرائیوروں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ حالانکہ ہوٹل کی انتظامیہ نے پس وپیش کی اور بتایا کہ ہوٹل میں داخلہ کے حقوق محفوظ ہیں۔ مگر گورنر اور وزیر اعلیٰ کے اصرار پر انتظامیہ کو اجازت دینا پڑی، واقعی۔ ع

سلطنتِ اہلِ دیں فقر ہے شاہی نہیں

طیارے کو حادثہ

نامعلوم یہ کوئی سازش تھی یا محض اتفاق۔ غالباً فروری ۷۳ء کے آغاز کی بات ہے۔ مفتی صاحب کو لائل پور جانا تھا۔ گورنر پنجاب مسٹر غلام مصطفیٰ کھر نے اپنا "سینا" طیارہ انہیں دیا۔ جونہی مفتی صاحب اور اُن کے دو ساتھی وزراء طیارے میں فروکش ہوئے، پتہ چلا کہ طیارے کی دُم میں آگ لگ گئی ہے۔ تینوں حضرات نے دوسرے عملہ سمیت طیارے سے کود کر جان بچائی۔ مفتی صاحب نے پشاور کے کمشنر کو تحقیقات کے لئے مامور کیا۔ کیونکہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا، شاید ٹائم بم کی وجہ سے آگ لگی ہو۔ ۱۵ر فروری ۷۳ء کو مفتی صاحب نے بلوچستان میں نیپ جمعیتہ وزارت کی برطرفی کے خلاف احتجاجی طور پر استعفاء دے دیا۔ بعد میں کمشنر نے کیا رپورٹ دی؟ معلوم نہ ہو سکا۔ غالب گمان یہی ہے۔ انہوں نے اس حادثے کو اتفاقی قرار دیا ہوگا۔

استعفاء

مسٹر بھٹو جو ہر ایک سے اپنی متابعت چاہتے ہیں، انہوں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیتہ کی مخلوط وزارتوں کو ذہنی طور پر قبول ہی نہ کیا تھا، چنانچہ انہوں نے ان حکومتوں کو ناکام بنانے کی سازشیں شروع کر دیں، پہلے مفتی صاحب کی حکومت نشانہ بنی، یہاں ناکامی ہوئی تو بھٹو صاحب کا رُخ بلوچستان کی جانب مُڑ گیا، جہاں اُن کے وفادار میر غلام قادر (جام آف لسبیلہ) نے بڑی "ہنرمندی" کے ساتھ "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ "پیدا" کیا۔ ادھر اسلام آباد میں عراقی سفارت خانے سے نہایت ڈرامائی انداز میں روسی اسلحہ پکڑا گیا۔ مسٹر بھٹو نے اِن واقعات کی آڑ میں، پہلے تو نیپ کے گورنروں پر وار کیا۔ بعد میں صوبہ بلوچستان کی مینگل وزارت برطرف کر دی۔ جسے ۲۰ کے ہاؤس میں ۱۳ ارکان کی حمایت حاصل تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ بلوچستان کے عوام کے ساتھ صریح زیادتی تھی۔ اگر روسی اسلحہ اسلام آباد سے برآمد ہوا تو اس میں ارباب اسکندر یا میر غوث بخش بزنجو کا کیا قصور تھا؟ بقول مولانا مفتی محمود "چوری کا مال جس گھر سے دستیاب ہو الزام تو اس پر آتا ہے"۔ مگر مسٹر بھٹو کو ان باتوں سے کیا واسطہ تھا۔ انہوں نے نیپ اور جمعیتہ کو پٹخنی دینا تھا سو انہوں نے دے دی۔ حالانکہ یہ اقدام اس معاہدے کے سراسر خلاف تھا۔ جو ۲۶/اپریل کو نیپ، جمعیتہ اور پی پی پی کے مابین راولپنڈی میں طے پایا تھا۔ بلوچستان میں نیپ و جمعیتہ کی مخلوط وزارت کی برطرفی کے فوراً بعد مولانا مفتی محمود نے اپنی کابینہ کا اجلاس بُلایا اور اپنے اور اپنی کابینہ کے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر انہوں نے یہ قرارداد منظور کرائی:

"صدرِ پاکستان نے ایک حکم کے ذریعے بلوچستان اور سرحد کے گورنروں کو برطرف

کر دیا ہے ۔ ایسا کر کے وہ اپنا یہ حق قائم کرنا چاہتے تھے کہ وہ عبوری آئین کے ایک آرٹیکل کے تحت صدر کی حیثیت سے گورنروں کو برطرف کر سکتے ہیں حالانکہ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں گورنروں کے تقرر کا اختیار نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کو ایک معاہدے کے تحت تفویض کیا گیا تھا ۔ جس پر ۲۶ اپریل ۱۹۷۲ء کو ملکی حالات کے پیش نظر دستخط ہوئے تھے ۔ صدر نے یک طرفہ طور پر اس معاہدے کو توڑ دیا ہے ۔ علاوہ ازیں ایک فرمان کے ذریعہ جو بعد دوپہر جاری کیا گیا ، بلوچستان میں نیپ و جمعیۃ کی مخلوط وزارت کو برطرف کر کے وہاں صدارتی راج نافذ کر دیا گیا ہے ۔ حالانکہ نیپ و جمعیۃ کی مخلوط پارلیمانی پارٹی کو اسمبلی کے دو تہائی ارکان کی تائید و حمایت حاصل ہے یہ فرمان جمہوری اقدار کے سراسر منافی ہے اور سیاسی انتقام کی ایک بیّن مثال ہے ۔ جمہوری دستور کے آرٹیکل ۱۳۶ کے تحت جس کا حوالہ وزارت کو برطرف کرتے وقت دیا گیا ہے ، ناجائز استفادہ کیا گیا ہے ۔

ضلع لسبیلا کے حالات کا اگر سندھ اور پنجاب کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کسانوں ، مزدوروں ، قیدیوں اور طلباء کو قتل کیا گیا ۔ ہزاروں سیاسی مخالفوں کو جیل میں ٹھونسا گیا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ۔ مرکزی حکومت کو ان صوبائی حکومتوں کا جبر و تشدد نظر نہیں آیا اور نہ ان حکومتوں کی ناکامی پر ان صوبوں میں صدارتی راج نافذ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی مخلوط سیاسی حکومتوں کو مرکزی حکومت نے سیاسی انتقام کا ہدف بنایا ہے ۔ بلوچستان کے آئین اور دستور کے مطابق حکومت کو غیر جمہوری طریقے سے برطرف کرنا ایک ایسا فعل ہے جو سزاوارِ احتجاج ہے ۔ لہذا ہم صوبائی کابینہ کے ارکان احتجاج کے طور پر اپنے عہدوں سے مستعفی ہوتے ہیں ۔ وزیر اعلیٰ نے اپنا استعفیٰ نئے گورنر کو بھجوا دیا ہے[1] ۔ ”

---

[1] ہفت روزہ ”ترجمان اسلام“ لاہور ص ۱۴ ۱۶ فروری ۱۹۷۳ء

مفتی صاحب نے اصول کی خاطر اقتدار کو ٹھوکر مار کر پاکستان میں پہلی دفعہ ایک اعلیٰ سیاسی روایت قائم کی۔ مرکزی حکومت اس دلیرانہ اقدام پر بھونچکا رہ گئی۔ جب کہ مُلک بھر میں مفتی صاحب کے اس اقدام کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ مفتی صاحب نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ جب میں صوبہ سرحد کا وزیرِ اعلےٰ بنا تو مجھے مبارک باد کے جو تار، پیغام اور خطوط ملے، وزارتِ اعلیٰ سے استعفےٰ پر مجھے اس سے کہیں زیادہ تار اور پیغام موصول ہوئے[1]

اُس دَور میں نواب اکبر بگٹی کا کردار نہایت افسوس ناک رہا۔ بعد میں جس کا صلہ اُنہوں نے صوبہ بلوچستان کی گورنری کی صورت میں وصول کیا۔

حکومت کی پیشکش اور اس کا استرداد

ہماری سیاست کا روزمرّہ یہ ہے کہ کُرسی آگے آگے اور سیاستدان اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ مگر مفتی صاحب کے معاملہ میں بات اس کے اُلٹ ہو گئی۔ یہاں مفتی صاحب آگے اور کُرسی ان کے پیچھے دوڑتی رہی۔ مگر اللہ کے اس بندے نے پیچھے مُڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

مفتی صاحب کے استعفاء کی خبر ملتے ہی مسٹر بھٹو نے اُنہیں اسلام آباد بُلایا اور کہا "حضرت آپ تو ہمارے امام ہیں۔ آپ کو کسی نے چھیڑا نہیں۔ آپ نے استعفٰی کیوں دیا؟ اپنا استعفاء واپس لیں" مفتی صاحب کا جواب تھا! "پہلے ہماری اُس شکایت کا تدارک کریں۔ جو استعفاء کا باعث بنی ہے۔ اگر آپ اس کے لئے تیار نہیں تو میں بھی استعفاء واپس لینے کو تیار نہیں"

---

[1] ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور کو مُفتی صاحب کا انٹرویو جولائی ۱۹۷۷ء

ادھر ۱۲؍فروری ۷۳ء کو مفتی صاحب نے لاہور میں مرکزی اور چاروں صوبائی مجالسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس میں جمعیتہ نے نہ صرف یہ کہ مفتی صاحب کے مستعفی ہونے کے فیصلہ کی توثیق کر دی۔ بلکہ نیشنل عوامی پارٹی (N.A.P) کیساتھ اتحاد برقرار رکھنے کا اعلان بھی کیا ——— مسٹر بھٹو نے ۱۵؍فروری سے ۱۲؍فروری تک سرتوڑ کوشش کی کہ مفتی صاحب مان جائیں۔ اور حکومت لے لیں مگر ادھر ایک ہی جواب تھا۔ "نہیں نہیں بالکل نہیں" جمعیتہ کی مجلسِ شوریٰ کی قرار داد نے اُن کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ چنانچہ اسی روز ۱۲؍فروری کو، صوبہ سرحد کے نئے گورنر مسٹر محمد اسلم خٹک نے مفتی صاحب کا استعفاء منظور کر لیا۔[1]

---

[1] ہفت روزہ "چٹان" (لاہور) کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ۵؍مارچ ۱۹۷۳ء "مفتی محمود کی سیاست" ص ۱۱۳، ۱۱۴ از قاری نور الحق قریشی ایڈوکیٹ۔

پندرھواں باب

آئینِ پاکستان کی تشکیل!

آئین و دستور ایک پٹری ہے جس پر ملکی نظام کی گاڑی چلتی ہے —— ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ ہمارے حکمران چھبیس سال تک اسلامی اصولوں اور ملّی تقاضوں سے ہم آہنگ کوئی دستورِ ملک اور قوم کو نہ دے سکے —— ۵۶ء اور ۶۲ء میں دو دستور ہمیں ملے۔ اُن میں ون یونٹ کی بات تو تھی - پیریٹی کا اصول بھی تھا، وفاقی پارلیمانی نظام بھی تھا اور صدارتی نظام بھی، مگر اسلام - وہ اسلام جو پاکستان کا سب سے بڑا تخلیقی عنصر تھا - وہ اسلام جس کے لئے لاکھوں افراد نے جان کی بازی لگائی تھی - وہ اسلام جس کے لئے لاکھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا - وہ اسلام جس کے لئے ہماری ماؤں، بہنوں، بہوؤں اور بیٹیوں کی عزتیں پامال ہوئی تھیں، وہ اسلام جو دین اور دنیا کا جامع ہے، وہ اسلام جو ہماری نجات کا ضامن ہے، وہ اسلام جو پاکستان کی بقاء کے ہم معنیٰ ہے - وہ ان ہر دو دساتیر میں کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا - ۶۲ء کے آئین کے خالق ایوب خاں تو پاکستان کے ساتھ

"اسلامیہ جمہوریہ" کا سابقہ تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ ۵۶ء کا دستور مرتب کرنے والوں نے بھی اسلام کے ساتھ ناقابلِ ستائش سلوک ہی کیا۔ یہ حکمرانوں کی ستم رانیاں تھیں دوسری طرف سیاستدان تھے جنہوں نے سیاست و انتظامِ ملکی میں سیکولرازم، سوشلزم، ڈیماکریسی اور صوبائی خودمختاری کے نعرے تو بلند کئے۔ بنیادی جمہوری حقوق کے چمپئن بھی بہت سے تھے، زبانی کلامی اسلام کا نام لینے والے بھی تھے، مگر اسلام کے سنہری اور ابدی اصولوں کو دستورِ پاکستان میں شامل کرانے والا ہمیں کوئی نظر نہیں آتا۔ خاص اس اعتبار سے مولانا مفتی محمود اور اُن کی جمعیتہ علمائے اسلام کی مساعی حد درجہ منفرد، قابلِ صد ستائش اور ہماری تاریخ کا ایک درخشاں اور یادگار باب ہے۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ!

مفتی صاحب کی مساعی

قراردادِ مقاصد، علماء کے بائیس نکات اور ایوب خاں کی گول میز کانفرنس (۶۹ء) میں مفتی صاحب کا رول تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ جب مسٹر بھٹو برسرِ اقتدار آئے تو ملک کے لئے ایک مستقل آئین کا مسئلہ پھر اُٹھا۔ اس موقع پر مفتی صاحب نے اسمبلی کے اندر اور باہر بے مثال جدّ و جہد کی —— اسمبلی کے اندر انہوں نے عبوری آئین کی غیر اسلامی اور غیر جمہوری دفعات پر کڑی تنقید کی۔ اسمبلی کے باہر ۴ جون ۱۹۷۲ء کو لاہور کی عظیم الشان ختمِ نبوت کانفرنس میں بحیثیت وزیرِ اعلیٰ صوبہ سرحد اعلان کیا: .... "عبوری آئین میں ہم نے اپنی وہ تمام صلاحیتیں صرف نہیں کی تھیں جنہیں ہم مستقل آئین کے لیے صرف کریں گے" انہوں نے کہا دستور میں سرکاری مذہب اسلام کو قرار دینا ہوگا اور پھر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔" اگر ہم نے دیکھا کہ پاکستان کے آئین کو اسلام

کے اصولوں سے منحرف ہو کر بنایا جا رہا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ہم اسلام کے اصولوں اور پاکستان کی بقاء اور سالمیت کے لیے لڑیں گے[1]،،

اور جب آئین سازی کے لئے تمام پارلیمانی پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک آئین ساز کمیٹی بنی تو اسلام کا یہ سپاہی وہاں سینہ سپر ہو گیا —— اسی جدّوجُہد کا ثمرہ تھا کہ ہمارے موجودہ دستور میں پہلی بار چند اہم اسلامی دفعات شامل ہُوئیں، دین اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ صدر اور وزیر اعظم کو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ حلفیہ طور پر ان پانچ چیزوں پر ایمان رکھنے کے اقرار کا پابند کیا گیا۔ (۱) توحیدِ الٰہی (۲) صحائف آسمانی، جن میں قرآنِ حکیم آخری صحیفہ ہے (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النّبیّین ہونے پر اور یہ کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ (۴) یوم قیامت (۵) قرآن و سنّت کے تمام تقاضوں اور تعلیمات پر۔

مفتی صاحب بیان کرتے ہیں: "اپوزیشن کو آئین میں اسلامی دفعات منظور کرانے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پیپلز پارٹی کے ارکان نے ہر قدم پر رکاوٹیں پیدا کیں، ...... قومی اسمبلی کی آئین ساز کمیٹی میں (جب) اپوزیشن نے وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شق پیش کی تو حزبِ اقتدار کے ارکان نے اس کی مخالفت کی ...... رائے شماری پر اپوزیشن کی یہ قرارداد ایک ووٹ سے تسلیم کر لی گئی" (اس وقت کے) "مرکزی وزیر داخلہ (خان عبدالقیوم خاں) ہر مرحلہ پر اس بات کی مخالفت کرتے رہے کہ صدر پاکستان اور وزیر اعظم کے لئے آئین میں مسلمان ہونے کی شرط رکھی جائے[2]،،

---

[1] ختمِ نبوت کانفرنس لاہور منعقدہ ۴ جون ۱۹۷۲ء بحوالہ اذانِ سحر" ص ۱۲۲ از شمس القمر قاسمی

[2] روزنامہ نوائے وقت" لاہور ۵ مئی ۱۹۷۳ء ختمِ نبوت کانفرنس ملتان میں تقریر۔

"یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مفتی صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے پاکستان کے دستور کی تشکیل میں گراں قدر حصّہ لیا۔ بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ جمہوری بنانے میں بھی مفتی صاحب کا بڑا حصّہ ہے۔ ملک کے ایک معروف سیاسی ہفتہ وار نے مارچ ۷۳ء میں مفتی صاحب کے بارے میں لکھا تھا:

"مفتی صاحب (بھٹو کے مقابلہ میں) ابھی تک ہر دباؤ اور تحریص کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ان کے اسی کردار سے بڑی حد تک نہ صرف دونوں صوبوں (سرحد اور بلوچستان) میں بحران کی گتھی سلجھے گی، بلکہ قومی سطح پر حزبِ اختلاف کی منشاء کے مطابق دستور کو آمریت کے سایوں سے بچانے میں بھی مدد ملے گی[1]"

مفتی صاحب نے حقیقی جمہوری دستور کے لئے نہ صرف قومی و سیاسی حلقوں کی توقعات کو پورا کیا بلکہ اپنا "پارٹ" اس خوبصورتی سے "پلے" کیا کہ اپنے پرائے سب عش عش کر اُٹھے۔

مستقل آئین کی تدوین کے موقع پر جب اپوزیشن نے سرکاری مسوّدہ دستور پر اختلافی نوٹ لکھے تو حکومت بوکھلا اُٹھی اور ایک بُحران پیدا ہوگیا۔ حکومت کا الزام یہ تھا اپوزیشن نے ۲۰ اکتوبر ۷۲ء کے آئینی سمجھوتے سے انحراف کیا ہے، اس سمجھوتے میں طے پایا تھا:

ا:۔ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔

ب:۔ ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔

ج:۔ صدر مسلمان ہوگا اور صدر کے عہدے کا حلف لیتے وقت اس بات کا بھی حلف اُٹھائے (گا) کہ وہ مسلمان ہے۔

---

[1] ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ص ۷۔ ۴ مارچ ۱۹۷۳ء

د۔ اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کے لئے اسلامی نظریہ کی کونسل قائم کی جائے۔

ھ۔ عدلیہ اور چیف الیکشن کمشنر انتظامیہ سے آزاد ہونگے۔

و۔ وفاقی پبلک سروس کمیشن میں ہر صوبے کے نمائندے ہوں گے۔ جن کا تقرر صدر مملکت صوبائی حکومتوں کی سفارش پر کریں گے۔

ز۔ سرکاری ملازموں کی ملازمت کا تحفظ آئین میں شامل نہیں ہوگا۔ یہ تحفظ قانون کے تحت ہوگا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔

ح۔ آئین میں ترمیم قومی اسمبلی کے دو تہائی ارکان کی تائید سے ہو سکے گی اور اس کے بعد سینٹ (SENATE) میں سادہ اکثریت سے اس کی توثیق لازمی ہوگی۔

ط۔ آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت شامل ہوگی۔

ی۔ شہریوں کو بلا جواز امتناعی نظربندی کے خلاف تحفظ دیا جائے گا۔

ک۔ قومی اسمبلی کے ارکان کی تعداد ۲۱۰ ہوگی جس میں ۱۰ خواتین شامل ہونگی۔ جنہیں اسمبلی کے باقی ارکان منتخب کریں گے۔

ل۔ سینٹ کے ارکان کی تعداد ساٹھ ہوگی۔ جس میں ہر صوبے کے ۱۴ نمائندے ہوں گے۔ ان کے علاوہ اسلام آباد کے وفاقی علاقے کے دو اور قبائلی علاقوں کے دو ارکان سینٹ کے رکن ہوں گے۔

اس آئینی سمجھوتے پر پارلیمانی پارٹیوں کے نمائندوں ـــــ صدر بھٹو (پی پی پی) خان قیوم (مسلم لیگ قیوم گروپ) غوث بخش بزنجو اور ارباب سکندر (نیپ) مولانا مفتی محمود (جمعیتہ علماء اسلام) سردار شوکت حیات (کونسل مسلم لیگ) میجر جنرل جمال دار خان (قبائلی ارکان) مولانا شاہ احمد نورانی (جمعیتہ علماء پاکستان) پروفیسر غفور احمد (جماعت اسلامی) سردار شیر باز مزاری (آزاد ارکان)۔ کے

دستخط تھے۔ اب حکومت اپوزیشن کو اسی معاہدے سے انحراف کا الزام دے رہی تھی۔ اس موقع پر تمام پارلیمانی پارٹیوں کو ریڈیو اور ٹی وی پر اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔ ساتھ ہی حکومت نے اپوزیشن لیڈروں پر تنقیدی سوالات کا اہتمام کیا۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر جو معرکہ آرا تقریر کی اور جس طرح انٹرویو لینے والے کو مسکت جواب دیئے وہ اُن کی آئینی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دستور کے پُر پیچ مسائل اور آئینی مندرجات و مضمرات پر یہ گفتگو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ اُس شخص کے خیالات ہیں جس نے ایک دن بھی کسی لا کالج یا یونیورسٹی سے قانون اور سیاسیات کا درس نہیں لیا۔ بلکہ تمام عمر مدرسہ کی چٹائی ہی جس کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔

بہر حال بڑی ردّ و کد کے بعد حکومت نے اپوزیشن کے چند اہم مطالبات تسلیم کر لئے۔ بعض سے اپوزیشن دستبردار ہو گئی اور اس طرح ۱۰ر اپریل ۱۹۷۳ء کو اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک آئین منظور کر لیا۔

یہ پاکستان کا پہلا وفاقی پارلیمانی آئین تھا۔ جسے عوام کے براہِ راست منتخب نمائندوں نے تشکیل دیا۔ اور جس میں پچھلے تمام دساتیر کی نسبت اسلام کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ ملی، نیز صوبائی خود مختاری کا مسئلہ بالاتفاق طے ہو گیا۔

سولھواں باب

متحدہ جمہوری محاذ، خونچکاں جدوجہد

بلوچستان میں نیپ اور جمعیتہ کی جمہوری حکومت کی غیر آئینی برطرفی اور مولانا مفتی محمود کے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے احتجاجاً استعفاٰ کے بعد مسٹر بھٹو کی حکومت کے خلاف ملک بھر میں جو احتجاجی لہریں پیدا ہوئیں۔ انہیں منطقی مفہوم سے آشنا کرنے کے لئے ملک کی تمام محب الوطن جماعتوں کے زعماء فروری ۷۳ء کے اواخر میں مل بیٹھے اور انہوں نے ایک بارہ نکاتی پروگرام پر اتفاق کرتے ہوئے "متحدہ جمہوری محاذ" (U.D.F) کے نام سے ایک محاذ کے قیام کا اعلان کیا۔ جو آگے چل کر "جمہوری محاذ" کے نام سے مشہور رہوا۔

اس محاذ میں پاکستان مسلم لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، جمعیتہ علماء اسلام، جمعیتہ علماء پاکستان، پی ڈی پی، جماعت اسلامی، خاکسار تحریک اور قومی اسمبلی کے آزاد ارکان شامل تھے۔ ایئر مارشل اصغر خان کی "تحریک استقلال" اس محاذ میں شامل نہ ہوئی۔ پیر صاحب پگارا کو اس محاذ کا قائد منتخب کیا گیا۔ مفتی صاحب نائب صدر قرار پائے۔

"متحدہ جمہوری محاذ" کے بارہ نکاتی پروگرام میں ملک کی سالمیت، پاکستان کے بنیادی نظریات کا تحفظ، جمہوری اقدار کی بحالی اور آزادیٔ تقریر و تحریر ایسے مطالبات شامل تھے۔

لیاقت باغ کا خونیں سانحہ

۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو "یوم پاکستان" کے موقع پر "متحدہ جمہوری محاذ" نے لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک بہت بڑے جلسۂ عام کا اعلان کیا۔ حکومت نے اس جلسۂ عام کو جس بُری طرح تاخت و تاراج کیا قلم اُس کے بیان سے قاصر ہے، روزنامہ "جنگ" راولپنڈی کا نمائندہ جس نے یہ خونیں سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کی قلمبند کی ہوئی تفصیل (ظاہر ہے یہ مکمل تفصیل نہ ہو گی) پڑھ کر آدمی پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے[1]

روزنامہ "ڈان" کراچی کے نمائندہ مقیم راولپنڈی نے لکھا "میں نے ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات کے بعد سے آج تک اتنا وحشت ناک منظر نہیں دیکھا۔ کہ جس میں انسانی زندگی اور اخلاق کا کوئی احترام نہ کیا گیا۔ ہزاروں راؤنڈ فائر ہوئے اور لیاقت باغ کے مضافات تین گھنٹے تک گولیوں اور گولوں کے دھماکوں سے گونجتے رہے۔ فضا میں ہر طرف جلتی ہوئی بسوں کا دھواں اور بارود کی بُو تھی اور شر پسند عناصر منافرت انگیز نعرے لگاتے ہوئے مخالفین پر حملے کر رہے تھے"[2]

جمہوری محاذ کے سیکرٹری جنرل پروفیسر عبد الغفور نے ایک عام اندازے کے مطابق ہلاک شدگان کی تعداد ۱۸ بتائی۔ روزنامہ "شہباز" پشاور نے ۵۰ اور روزنامہ "جمہور" لاہور کے مطابق اس ہنگامے میں کم از کم ۳۰ افراد ہلاک ہوئے۔ جبکہ ۲۳

---

[1] دیکھیں روزنامہ "جنگ" راولپنڈی ۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء

[2] ررزنامہ "ڈان" کراچی ۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء

مارچ کو حکومت نے جو پریس نوٹ جاری کیا۔ اُس میں لکھا تھا ”ضلعی ہسپتالوں کی اب تک کی رپورٹ کے مطابق سات افراد ہلاک اور چھتّر افراد زخمی ہو گئے۔“

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جمہوری محاذ کے جملہ مرکزی رہنما پیر پگارا، خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان، مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر عبدالغفور احمد وغیرہ آتش و خون کے اس معرکے میں آخر وقت تک اسٹیج پر ڈٹے رہے۔ حکومت اس قتلِ عام سے کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟ صرف یہ کہ آئندہ لوگ اپوزیشن کے جلسۂ عام میں شرکت کا تصور تک نہ کریں۔ ”جمہوری محاذ“ نے ان لرزہ خیز حالات کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی، دوسرا جلسہ پشاور میں ہوا۔ پھر محاذ کے رہنما بلوچستان پہنچے۔ جہاں تاریخ کا سب سے بڑا جلوس نکلا۔ اسی طرح حیدرآباد، ملتان اور لاہور میں جلسہ ہائے عام منعقد کئے گئے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ”متحدہ محاذ“ کا جگنو چمکتا رہا۔

ٹرین پر حملہ

۲؍ جون ۱۹۷۳ء کو ”متحدہ محاذ“ کے رہنماؤں کا ایک کاروان پیر پگارا شریف کی سیادت میں تیزگام سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہوا۔ اس میں خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خاں، میاں طفیل محمد، مولانا شاہ احمد نورانی، ملک محمد قاسم، چودھری ظہور الٰہی اور درجنوں کارکن سوار تھے۔ گاڑی گوجرانوالہ پہنچی تو چند افراد نے جو پلیٹ فارم سے باہر جنگلے کے پاس کھڑے تھے ریوالوروں سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ چند گولیاں گاڑی میں لگیں، گاڑی وزیر آباد پہنچی تو وہاں ایک بم گاڑی کے نیچے آگرا اور پھٹ گیا۔ گاڑی لرز گئی۔ یہ بم اسٹیشن کی عمارت کے چھجے پر بیٹھے چند افراد پھینک رہے تھے۔ دوسرا بم اس کے بعد پھٹا، تیسرا بم لاؤڈ اسپیکر کو دولخت کر گیا۔ کئی کارکن زخمی ہو گئے۔ گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر نے اس پر یہ دلچسپ

بیان جاری کیا کہ "اپوزیشن لیڈروں کے یہ الزامات کہ ان پر دستی بموں سے حملہ کیا گیا درست نہیں، صرف وزیرآباد ریلوے اسٹیشن پر تین پٹاخے چھوڑے گئے ممکن ہے یہ پٹاخے ان لیڈروں کے مداحوں نے استقبالیہ طور پر چھوڑے ہوں"[۵]

مری مذاکرات

مسٹر بھٹو کا طریق واردات بڑا دلچسپ تھا۔ ایک طرف اپوزیشن کو غیر محبِ وطن ٹھہراتے۔ مذمت کے ساتھ اس کی "مرمت" کا اہتمام کرتے اور جب وہ لہولہان ہو جاتی تو کہتے چلو آؤ صلح کرلیں۔ لڑائی اچھی نہیں، محب الوطن اپوزیشن سب کچھ بھول بھال، اہم قومی معاملات پر مسٹر بھٹو کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہو جاتی۔ ٹھیک یہی مری مذاکرات کا پس منظر ہے

مسٹر بھٹو نے ایک طرف اپوزیشن پر تابڑ توڑ سیاسی و جسمانی حملے کئے۔ لیاقت باغ کو بے گناہوں کے خون سے نہلایا اور جب دیکھا کہ اپوزیشن ہلکان ہو گئی ہے تو ۲۹، جون کو مری میں مذاکرات کی دعوت دے ڈالی۔ ایک وجہ اور بھی تھی مسٹر بھٹو وسط جولائی میں امریکا۔ برطانیہ اور فرانس کے دورے پر جا رہے تھے۔ بیرون دنیا کو یہ "تاثر دینے کیلئے کہ اپوزیشن میرے ساتھ ہے وہ اپوزیشن کا "مینڈیٹ" حاصل کرنا چاہتے تھے اپنی نیک نیتی ظاہر کرنے کے لئے ۲۷، جون کو گورنرز کانفرنس بھی ملتوی کر دی۔ اپوزیشن نے الجھے ہوئے ملکی مسائل کو سلجھانے کی غرض سے نہایت کھلے دل سے مسٹر بھٹو کی دعوت قبول کر لی۔ چنانچہ ۲۹، جون کو مری میں مسٹر بھٹو اور صوبہ سرحد اور بلوچستان سے نیپ اور جمعیت کے نمائندوں

۵۔ ہفت روزہ "چٹان"، لاہور ۱۱، جون ۱۹۷۳ء

خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل وغیرہ کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ ۲۹ جون کو تمام پارلیمانی پارٹیوں کے سربراہ ان مذاکرات میں شامل ہوئے۔ اپوزیشن کا موقف تھا قانون کی حکمرانی بحال کی جائے، نیا آئین نافذ کیا جائے۔ ہنگامی حالات ختم کئے جائیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نمائندہ حکومتیں قائم کی جائیں۔ اسی طرح کچھ اور مطالبات بھی تھے۔ مسٹر بھٹو نے زبانی کلامی بہت کچھ تسلیم کیا۔ مگر کوئی نتیجہ خیز بات نہ کی۔ البتہ یہ تأثر دیا کہ بات چیت مزید ہوگی۔

مذاکرات کے اختتام پر جب ایک اخبار نویس نے مفتی صاحب سے اُن کے تأثرات دریافت کئے تو انہوں نے کہا "صدر نے حزبِ اختلاف کی جانب سے اٹھائے جانیوالے بیشتر مطالبات سے اصولی طور پر اتفاق کیا ہے۔ لیکن وہ کہاں تک ان مطالبات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ اُن کے عمل سے آئندہ چند روز میں معلوم ہو جائے گا[1]"

آئندہ چند روز تو کیا حکومت نے اُسی رات عبوری آئین میں دسویں ترمیم کرکے مری مذاکرات پر پانی پھیر دیا۔ اس ترمیم کے تحت صوبائی گورنر کو بجٹ منظور کرنے کا اختیار دیا گیا[2] جس کا مطلب تھا کہ صوبہ بلوچستان میں اپوزیشن کی اکثریت کے باوجود بجٹ کی منظوری گورنر دے گا۔ ایک اور ترمیم کی اور اعلیٰ عدالتوں کے اختیاراتِ سماعت محدود کر دیئے۔ اُدھر سینیٹ کا الیکشن آ گیا۔ اُسے جیتنے کے لئے دوسری جماعتوں کے ارکان توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بعض سیاسی رہنماؤں پر کُھلے بندوں قاتلانہ حملے کر لئے ——— ان واقعات نے مسٹر بھٹو کی ذہنیت کو پوری طرح واشگاف کر دیا۔

متحدہ حزبِ اختلاف نے اس تلخ تجربے سے گہرا سبق سیکھا۔ اس کا اعتماد مسٹر بھٹو سے بالکل اُٹھ گیا اور اُس نے بھرپور کردار ادا کرنے کا فیصلہ لیا چنانچہ حکومت کے

---

[1] روزنامہ "حریت" کراچی یکم جولائی ۱۹۷۳ء
[2] روزنامہ "مساوات" لاہور ۳۰ جون ۱۹۷۳ء

"اس پروپیگنڈے کے جواب میں کہ" اپوزیشن کے ساتھ افہام وتفہیم کے ذریعے مسائل حل کرنے کے اصول پر اتفاق رائے ہوگیا ہے"۔ اور" صدر کے ساتھ پارلیمانی رہنماؤں کے مذاکرات جاری رہیں گے[1]" ۳؍جولائی کو اپوزیشن نے اعلان کر دیا" صدر بھٹو کے دورۂ امریکہ سے قبل بات چیت کی کوئی دعوت قبول نہیں کی جائے گی[2]"

بنگلہ دیش نامنظور

اس دوران حکومت بنگلا دیش منظور کرنے کی قرارداد اسمبلی میں لے آئی حکومت بنگلا دیش کو تسلیم کرنا چاہتی تھی۔ —— اس مسئلے کا صحیح حل تو یہ تھا کہ حکومت دوسرے سیاسی رہنماؤں کو بیچ میں ڈال کر شیخ مجیب کو جو سقوط کے بعد مغربی پاکستان میں محبوس تھے۔ متحدہ پاکستان کا وزیر اعظم بننے پر آمادہ کرتی۔ یہ صورت مسٹر بھٹو کو قابلِ قبول نہ تھی۔ انہوں نے برسرِ اقتدار آنے کے فوراً بعد شیخ مجیب سے خفیہ مذاکرات کیئے، دیگر سیاسی لیڈروں کے اصرار اور مطالبے کے باوجود انہیں شیخ مجیب سے ملاقات کی اجازت نہ دی اور چپکے چپکے انہیں (شیخ مجیب کو) ایک خصوصی طیارے کے ذریعے لندن بھجوا دیا —— اب دو صورتیں تھیں یا بنگلہ دیش تسلیم کر لیا جائے۔ یا پھر" نامنظور" ملک کی عمومی فضا بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے کے حق میں تھی۔ مفتی صاحب نے ۷؍جون ۷۲ء کو بحیثیت وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد ملتان سے پشاور جاتے ہوئے وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر اخبار نویسوں کے ایک سوال کے جواب میں بنگلہ دیش کے بارے میں کہا کہ" اسے کسی صورت میں بھی تسلیم نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ بنگلہ دیش غیر ملکی طاقتوں کی سازشوں کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور اسکی حیثیت

---

[1] روزنامہ" مساوات" لاہور، ۳؍جون ۱۹۷۳ء

[2] روزنامہ" نوائے وقت" لاہور ۴؍جولائی ۱۹۷۳ء

بالکل اسرائیل جیسی ہے جو عربوں کو ننگ کرنے کے لئے امریکا کے ایما پہ وجود میں آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر بھارت اور روس بنگلہ دیش کی حمایت چھوڑ دیں تو بنگلہ دیش اپنی موت آپ مر سکتا ہے[1]" ——— بہرکیف حکومت بنگلہ دیش منظور کرنے کی قرارداد اسمبلی میں لے آئی۔ اتفاق یہ ہوا کہ سپریم کورٹ نے فیصلہ صادر کر دیا:

"بنگلہ دیش کے بارے میں قومی اسمبلی کی سرکاری قرارداد کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی[2]" اپوزیشن نے اس مرحلہ پر بھرپور سیاسی لڑائی لڑنے کی ٹھان لی اور قرارداد کی مخالفت کا فیصلہ کیا۔ نیپ بھی دیگر جماعتوں کی ہمنوا ہوگئی۔ چنانچہ ۹ر جولائی کو جب مسٹر بھٹو (جو اس وقت صدر تھے) اس قرارداد کے حق میں تقریر کرنے کے لیے اسمبلی میں آئے تو اپوزیشن نے اُن کی تقریر سُننے سے انکار کر دیا۔ جیسے ہی مسٹر بھٹو قومی اسمبلی کے ایوان میں داخل ہوئے اپوزیشن واک آؤٹ کر گئی۔ اور صدر بھٹو کی تقریر کے بعد ایوان میں واپس آئی[3]۔ اپوزیشن کا یہ وار بہت کاری ثابت ہوا۔ ۱۳ر جولائی کو واشنگٹن نے بغیر کوئی نئی تاریخ مقرر کئے یکطرفہ طور پر مسٹر بھٹو کے دورے کے التوا کا اعلان کر دیا[4]۔ اس کے باوجود مسٹر بھٹو فرانس اور برطانیہ کے دورے پر گئے۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ ان دونوں ملکوں میں مذاکرات کے اختتام پر مشترکہ اعلامیے جاری نہ ہوئے۔ ظاہر ہے یہ ملک کی سخت رُسوائی تھی۔ ایسا صرف اس لئے ہوا کہ مسٹر بھٹو نے اندرونِ ملک لڑائی باندھ رکھی تھی۔ اور اپنا اعتماد کھو دیا تھا۔

لاہور کنونشن

اس دوران متحدہ جمہوری محاذ نے لاہور میں ایک کنونشن کا انعقاد کیا جس

---

[1] روزنامہ "امروز" لاہور ۸ر جون ۱۹۷۲ء

[2] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۸ر جولائی ۱۹۷۳ء

[3] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۴ر جولائی ۱۹۷۳ء

[4] ایضاً ۱۰۔ جولائی ۱۹۷۳ء

میں خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، پیر صاحب پگارا شریف، مولانا شاہ احمد نورانی اور دیگر مرکزی رہنماؤں نے شرکت کی۔ ادھر محاذ کی مجلسِ عمل نے متفقہ فیصلہ کیا کہ "متحدہ محاذ اب حکومت سے کوئی بات چیت نہیں کرے گا"[1]۔ مفتی صاحب نے اس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا: "ملک کے تمام اندرونی اور بیرونی مسائل ایک غلط کار سیاستدان کی وجہ سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ عالمی سطح پر اس نے ہمارا وقار خاک میں ملا دیا۔ اور ہمیں کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ صدر بھٹو سے آئندہ پیشگی شرطیں منوائے بغیر بات چیت نہ ہو گی ...... مری مذاکرات میں صدر بھٹو نے اپوزیشن کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ بیرونی دورہ کامیاب رہے اور میں دنیا کو یہ تاثر دے سکوں کہ اپوزیشن میرے ساتھ ہے، اور سینیٹ کے انتخابات جیت لئے جائیں۔ لیکن اپوزیشن نے اسمبلی میں صدر بھٹو کی تقریر سننے سے انکار کر کے دنیا کو بتا دیا کہ وہ صدر پر اعتماد نہیں کرتی۔ مزید برآں بنگلہ دیش کی قرارداد کو مسترد کر کے بھی اپوزیشن نے حکمرانوں کے بارے میں اپنا موقف واضح کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی ممالک کا دورہ ناکام رہا۔ اور مری میں انہوں نے ہمارے لئے جو جال پھیلایا تھا۔ ہم نے اس کا بدلہ لے لیا۔ درحقیقت اپوزیشن نے پہلی بار قومی اسمبلی میں صحیح معنوں میں اپوزیشن کا کردار ادا کیا۔ اور اب آئندہ ایسا ہی کیا جاتا رہے گا"[2] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے دو دن (۳۰، اور ۳۱، جولائی) یہ خبر چھاپی۔

بلوچستان کا مسئلہ

بلوچستان ہمارے ملک کا نہایت حساس صوبہ ہے۔ گہرے پانیوں اور جغرافیائی

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۱۴ جولائی ۱۹۷۳ء

[2] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۳۰، جولائی ۱۹۷۳ء

محلِ وقوع کے اعتبار سے "گلوبل سٹریٹیجی" میں اس کو حد درجہ اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے بیرونی طاقتیں اس صوبے پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ یہ صوبہ ہمیشہ ہی نشانۂ ستم بنتا رہا ہے۔

اپریل ۷۲ء کے سہ فریقی مذاکرات کے نتیجہ میں یہاں نیپ اور جمعیتہ کی مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ جسے ۲۰ کے ایوان میں ۱۳ نشستوں کی اکثریت حاصل تھی۔ بقول مسٹر بھٹو شاہ ایران یہ نہیں چاہتے تھے کہ بلوچستان میں سردار مینگل (یعنی نیپ اور جمعیتہ) کی حکومت قائم ہو[1]۔ جیسا کہ مسٹر بھٹو نے ایک ملاقات میں خان عبدالولی خان کو بتایا۔ خان عبدالولی خان نے مسٹر بھٹو کا یہ بیان اُس دور میں بار بار دہرایا۔ نہ تو مسٹر بھٹو ہی نے اس کی تردید کی، نہ شاہ ایران نے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ شاہ ایران نے مسٹر بھٹو کو تہران طلب کر لیا۔ بعد میں نیپ کے سربراہ اور صوبہ بلوچستان کے گورنر کو بھی طلب کیا گیا۔ خان عبدالولی خان تو بوجوہ نہ جا سکے۔ البتہ گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو تہران گئے۔ بعد میں مسٹر بھٹو واپس آ گئے اور میر غوث بخش بزنجو کو شاہ ایران نے اپنے مہمان کی حیثیت سے وہیں ٹھہرا لیا۔ اور کئی روز تک ایرانی بلوچستان کی سیر کراتے رہے۔ قیاس ہے شاہِ ایران نے اس دوران اپنی پوزیشن واضح کی ہو گی۔

مختصر یہ کہ فروری ۷۳ء میں مسٹر بھٹو نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر برطرف کر دیئے اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیتہ کی مخلوط مینگل وزارت توڑ ڈالی۔ اس کا جو ردِ عمل بلوچستان کے عوام میں ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ ملک کی سلامتی کو گوناگوں خطرات لاحق ہو گئے۔ قوم مشرقی پاکستان کے زخموں سے چور تھی۔ مسٹر بھٹو کی عاقبت نا اندیشی نے ایک دوسرا المیہ جنم دے

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور۔ ۳ جولائی ۱۹۷۳ء

دیا۔ حقیقت یہ ہے۔ مولانا مفتی محمود نے اس موقع پر نہایت حوصلہ مندی اور تدبر کے ساتھ صورتِ حال کا سامنا کیا۔ اس مرحلہ پر مفتی صاحب کا رول ہماری ملکی سیاست کا ایک یادگار باب ہے، جس پر مستقبل کا مؤرخ مفتی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کئے بغیر کبھی نہ گذر سکے گا۔ مفتی صاحب جو اُس وقت صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ وہ مسٹر بھٹو کے اس غیر آئینی اقدام پر تمام تر ترغیب و تحریص کے باوجود احتجاجاً مستعفی ہو گئے۔ اور اس طرح انہوں نے ملک بھر میں یہ احساس پیدا کیا۔ کہ بلوچستان کے ساتھ شدید قسم کی زیادتی اور ناانصافی ہوئی ہے۔

عبوری آئین کے تحت کسی صوبہ میں دو ماہ تک صدر راج کا نفاذ ممکن تھا۔ اس کے بعد اس کی مدت میں اضافے کا اختیار قومی اسمبلی کو تھا۔ مسٹر بھٹو نے دو ماہ گذر جانے پر بھی خود اپنے بنائے ہوئے عبوری آئین کے کسی تقاضے کو پورا کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس پر مفتی صاحب نے شدید احتجاج کیا۔ ۲۲ اپریل کو پشاور میں ایک بیان میں مفتی صاحب نے کہا ”اگر اس وقت ملک پر عبوری آئین کے تحت حکمرانی ہے تو بلوچستان کی صورتِ حال قطعی طور پر غیر آئینی ہے۔ (کیونکہ) عبوری آئین کے تحت کسی صوبہ میں دو ماہ تک صدر راج نافذ رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اس کی مدت میں اضافہ کا اختیار قومی اسمبلی کو ہے“ ساتھ ہی استفسار کیا ”بلوچستان میں جب کہ ایک اکثریتی جماعت موجود ہے اور بلوچستان اسمبلی کو بھی توڑا نہیں گیا۔ تو پھر اکثریتی پارٹی کو وزارت سازی کی دعوت دینے میں کون سی چیز مانع ہے[1]؟“ مسٹر بھٹو پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ انہوں نے بلوچستان کے عوام پر مشقِ ستم اور تیز کر دی۔ عوام اور فوج کے درمیان جھڑپیں خطرناک صورت اختیار کر گئیں۔

---

[1] روزنامہ ”نوائے وقت“ لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۷۳ء

تحریک سول نافرمانی

اُدھر مسٹر بھٹو کی خون آشامی اپنے جوبن پر تھی۔ اِدھر جمہوری محاذ بھی سرفروشی کی تمنا دل میں لئے آخری حد تک جانے پر تُل گیا۔ ۳۰؍ جولائی کو ایک قرار داد کے ذریعہ محاذ نے حکومت کو خبردار کیا: "اگر شہری آزادیاں ۱۴؍ اگست تک بحال نہ کی گئیں۔ تو ملک گیر تحریک شروع کر دی جائے گی"۔ سات مزید مطالبات پیش کئے اور دھمکی دی کہ اگر ۱۴؍ اگست تک انہیں عملاً تسلیم نہ کیا گیا تو محاذ میں شامل جماعتیں یا افراد حکومت کے ساتھ کسی قسم کے سیاسی مذاکرات نہیں کریں گے۔ وہ مطالبات یہ تھے:

۱۔ ہنگامی حالات کا خاتمہ کیا جائے، عوام کے بنیادی حقوق اور شہری آزادیاں بحال کی جائیں۔ تحریر و تقریر پر موجود پابندیاں ختم کی جائیں۔

۲۔ بلوچستان کے اندرون سے فوج کو ہٹا کر بیرکوں میں واپس لایا جائے اور آئندہ فوج کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

۳۔ بلوچستان میں غیر آئینی طور پر برطرف کی ہوئی منتخب حکومت کو بحال کیا جائے۔

۴۔ ایف ایس ایف کو سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے استعمال نہ کیا جائے، اور اسے فوج کے کنٹرول میں دے دیا جائے۔ وغیرہ۔

مگر اگست کے اواخر میں پہاڑ کچھ اس طرح روئے کہ پنجاب پانیوں میں بہہ نکلا۔ سیلاب نے وہ تباہی مچائی کہ الاماں۔ ایسے میں سول نافرمانی کی تحریک گومگو کا شکار ہو گئی۔ جماعت اسلامی نے اختلاف کیا، کچھ "سرپھرے" اڑے رہے، اگر تحریک نہ چلتی تو حکومت کو محاذ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا،

محاذ کے فدا کاروں نے جان کی بازی لگا دی۔ دو تین عوامل (سیلاب، بے پناہ خوف و ہراس اور باہمی اختلاف) کے باعث یہ تحریک اگرچہ اپنے مقاصد تو حاصل نہ کر سکی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اپوزیشن نے ملک میں قبرستان کا سناٹا قائم نہ ہونے دیا۔ اس تحریک کو کچلنے کے لئے مسٹر بھٹو کی حکومت نے حد درجہ شرمناک ہتھکنڈے استعمال کئے۔ حکومت نے اپنے معمر اور بزرگ سیاسی مخالفین کی شلواریں اور پتلونیں اُتروا کر اُنہیں انڈے پیش کئے کہ وہ خود انہیں اپنے پیچھے سے لیں ورنہ یہ کام پولیس انجام دے گی۔ اور مشٹنڈوں کو اُن پر چھوڑا کہ وہ ان کے ساتھ اغلام کریں۔ علماء کے ساتھ الف ننگی فاحشہ عورتوں کو بٹھا کر اُن کی تصویریں اُتروائیں۔ غرض اس تحریک کو دبانے کے لئے مسٹر بھٹو کی حکومت بدتہذیبی کی آخری حد تک پہنچ گئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کہ اُس نے کوئی حد ہی نہ رہنے دی۔

مولانا شمس الدین کی شہادت

مسٹر بھٹو کے محض ساڑھے پانچ سالہ دورِ اقتدار میں جتنے سیاسی قتل ہوئے۔ پاکستان کی پوری سیاسی تاریخ میں اُتنے قتل نہ ہوئے۔ ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق اور عبدالصمد اچکزئی ایسی شخصیتیں ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ تو "خون آشام" بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور جمعیۃ علماءِ اسلام کے جواں سال رہنما مولانا سید شمس الدین کے درپے ہوئے۔ ۱۲، مارچ ۱۹۷۴ء کو سناؤنی آ گئی اور مولانا بلوچستان کی سیاسی کربلا" میں شہید کر دیئے گئے۔ خدا مرحوم کے درجات بلند کرے، آپ اسلام کے سچے سپاہی، ایک عظیم محبِّ وطن اور ناقابلِ فروخت (UNPURCHASEABLE) انسان تھے۔ مفتی صاحب سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ مفتی صاحب بھی مرحوم

کی بے حد قدر کرتے۔ جب آپ کو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر ملی تو تڑپ اُٹھے۔ مفتی صاحب نے اقتدار کے ایوانوں میں فرد کش قاتلوں کی طرف اُنگلی اٹھا کر کہا:

"مولانا سید شمس الدین کا قتل ایک فرد کا قتل نہیں۔ بلکہ یہ ظالم اور مظلوم کے مابین جنگ کا عنوان ہے۔ یہ دنیا کبھی ظالموں سے خالی نہیں رہی دنیا میں زر و جواہر کے گرانڈیل بتوں کے پجاریوں نے ہمیشہ امن و آشتی کا ڈھونگ رچایا اور اُن کی آستینوں میں چھپے ہوئے خنجر اللہ کے نیک بندوں کا خون بہاتے رہے۔ تاریخ کا کوئی باب ایسا نہیں جو بے گناہوں کی خونی داستانوں سے سیاہ نہ ہو۔ لیکن ظالموں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ تاریخ میں جہاں ہٹلر اور مسولینی کا نام ہے وہاں حسین ابنِ علی رضؓ کی قربانی کی لازوال داستان بھی محفوظ ہے۔ مولانا سید شمس الدین کا وجود ظالم طاقتوں کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اور مظلوموں کے لئے ایک ڈھال۔ مولانا سید شمس الدین کا خون تاریخ کے اوراقِ کہنہ ضرور پلٹے گا۔ اور ظالم تاریخ اور وقت کے احتساب سے کبھی نہ بچ سکیں گے۔ ہم ظلم کی حمایت کبھی نہیں کریں گے۔ خواہ ہمیں ہزاروں شمس الدین قربان کرنے پڑیں۔ آج "عوامی حکومت" کے دامن پر کتنے ہی خون ہیں اور کوئی پُرسش نہیں۔ اس سے پہلے کتنی ہی "رجعت پسند" وزارتیں قائم ہوئیں، لیکن اُن کے طویل زمانہ میں اتنے خون نہیں ہوئے۔ لیکن کئی فرعون اب تک تاریخ عالم سے مٹ گئے ہیں، مظلوموں کی جِدّ و جُہد ضرور بار آور ثابت ہوگی"[1]

فطرت 'لہو ترنگ' ہے غافل! 'نہ جل ترنگ'

---

[1] "سید شمس الدین شہید" ص ۶۰ از اشفاق ہاشمی

سترہواں باب

قادیانی مسئلے کا آئینی حل

(مفتی صاحب کی خدمات)

قدرت جب کسی کو سزا دینا چاہتی ہے تو انتظام بھی عجیب و غریب کرتی ہے ۔ قادیانیوں کی اسلام اور پاکستان دشمن سرگرمیوں کے باعث مسلمانانِ پاکستان پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے ۔ اُدھر مئی ۷۴ء کے آخری دنوں میں منہ زور قادیانیوں نے ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج (ملتان) کے مسلمان طلبہ کو پیٹ ڈالا ۔ یہ بھس میں چنگاری ڈالنے والی بات تھی ۔ ملک بھر میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا ۔ چند ہی دنوں میں قادیانیوں کو لینے کے دینے پڑ گئے ۔ شہروں کے شہر اور بستیوں کی بستیاں ناموسِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تحفظ کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑیں ——— ۵۳ء کے بعد یہ اس مسئلے پر دوسری زوردار تحریک تھی ، جب حکومت نے دیکھا کہ یہ سیلِ بے پناہ کسی طرح نہیں تھمتا تو وہ اس مسئلے کو قومی اسمبلی میں لے گئی ۔

مولانا مفتی محمود نے اس موقع پر اسمبلی کے اندر اور باہر جس محنت ، لگن اور تدبر کے ساتھ یہ معرکہ لڑا واقعہ یہ ہے وہ انہی کا حق تھا اور بلاشبہ اس پر وہ

پوری ملّتِ اسلامیہ کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حزبِ اختلاف کی قرارداد

۳۰ر جون ۷۴ء کو حزبِ اختلاف کے ۳۷ر ارکان نے جن میں سرِ فہرست مفتی صاحب کا نام تھا۔ یہ قرارداد ایوان میں پیش کی:

جنابِ اسپیکر
قومی اسمبلی پاکستان محترمی!

ہم حسبِ ذیل تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں:

.... یہ ایک مکمل مسلّمہ حقیقت ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد نے آخری نبی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلّم کے بعد نبی ہونے کا دعوٰی کیا۔ نیز..... نبی ہونے کا اس کا جھوٹا اعلان بہت سی قرآنی آیات کو جھٹلانے اور جہاد کو ختم کرنے کی اُس کی کوششیں اسلام کے بڑے بڑے احکام کے خلاف غدّاری تھیں۔..... وہ سامراج کی پیداوار تھا اور اس کا واحد مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنا اور اسلام کو جھٹلانا تھا...... پوری اُمّتِ مسلّمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار چاہے وہ مرزا غلام احمد مذکور کی نبوّت کا یقین رکھتے ہوں یا اُسے اپنا مصلح یا مذہبی رہنما کسی بھی صورت میں گردانتے ہوں دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

.... اُن کے پیروکار چاہے انہیں کوئی بھی نام دیا جائے مسلمانوں کے ساتھ گھُل مِل کر اور اسلام کا ایک فرقہ ہونے کا بہانہ کرکے اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

...... عالمی مسلم تنظیموں کی ایک کانفرنس میں جو مکّۃ المکرمہ کے مقدّس

شہر میں رابطۃ العالم الاسلامی کے زیرِ انتظام ۶ اور ۱۰ اپریل ۱۹۷۴ء کے درمیان منعقد ہوئی اور جس میں دنیا بھر کے تمام حصوں سے ۱۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں کے وفود نے شرکت کی متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ قادیانیت اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے جو ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

اب اس اسمبلی کو یہ اعلان کرنے کی کارروائی کرنی چاہیئے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار، انہیں چاہے کوئی بھی نام دیا جائے۔ مسلمان نہیں اور یہ کہ قومی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے تاکہ اس اعلان کو مؤثر بنانے کے لئے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے جائز حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے احکام وضع کرنے کی خاطر آئین میں مناسب اور ضروری ترمیمات کی جائیں[1]"

اسمبلی کے اندر

یکم جولائی کو اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے اور کوئی حل تجویز کرنے کی غرض سے قومی اسمبلی کے تمام ارکان پر مشتمل خصوصی کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ ایک "رہبر کمیٹی" قائم ہوئی۔ "حزبِ اختلاف" نے "رہبر کمیٹی" کی معرفت تجویز کیا۔ کہ چونکہ اس معاملے کا ایک فریق قادیانی ہیں، انہیں بھی اسمبلی میں بلانا چاہیئے۔ اور ان کے دلائل سننا چاہییں تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے دلائل سنے بغیر فیصلہ کیا گیا ——— حزبِ اختلاف کی اس تجویز پر مرزا ناصر احمد اور لاہوری پارٹی

---

[1] "ملتِ اسلامیہ کا موقف" ص ۱۱ منجانب ۳۷ ارکان قومی اسمبلی پاکستان

کے سربراہ کو اسمبلی میں طلب کیا گیا۔ مرزا ناصر احمد شلوار کُرتے میں ملبوس سفید طُرّے دار پگڑی باندھ کر آئے۔ متشرّع سفید ڈاڑھی، جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی زبان پہ لاتے تو پورے ادب کے ساتھ درود شریف پڑھتے، قرآن مجید کی آیت بھی پڑھ لیتے، سادہ لوح ارکانِ اسمبلی اس پہ بہت ضغطے میں پڑے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ ڈاڑھی والے۔ سفید پگڑی والے جو درود بھی بھیجتے ہیں۔ آیتیں بھی پڑھتے ہیں۔ یہ کیسے کافر ہو سکتے ہیں؟ ایسے ماحول میں جبکہ ارکان اسمبلی کے رُخ بالکل مخالف تھے، ان کے ذہنوں کو تبدیل کرنا نہایت کٹھن کام تھا۔ خود مفتی صاحب بیان کرتے ہیں "یہ مسئلہ بہت بڑا مشکل تھا[1]" خدا تعالےٰ نے پورے ایوان پر مشتمل اس خصوصی کمیٹی کے رُوبرُو حزبِ اختلاف کی ترجمانی کا شرف مفتی صاحب کو عطا کیا۔ جنہوں نے رات رات بھر جاگ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں مطالعہ کیں، حوالے نوٹ کئے اور پھر جرحی سوالات کو ترتیب دیا اسی کا نتیجہ تھا کہ جب مرزا ناصر احمد کے طویل بیان کے بعد جرح کا آغاز ہوا تو بقول مفتی صاحب "ہمارا کام پہلے ہی دن بن گیا"[1]

مرزا ناصر پر جرح

اُس روز نمائندگانِ اسلام اور نمائندگانِ ارتداد کے مابین جو سوال و جواب ہوئے اُن کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

سوال:۔ مرزا غلام احمد کے بارے میں آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب:۔ وہ اُمتی نبی تھے۔ اُمتی نبی کا معنیٰ یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ کا فرد جو آپ کے کامل اتباع سے نبوّت کا مقام حاصل کرے۔

---

[1] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۷۵ء ص ۴۱

سوال :۔ اس پر وحی بھی آتی تھی ؟

جواب :۔ آتی تھی ۔

سوال :۔ خطا کا کوئی احتمال ؟

جواب :۔ بالکل نہیں ۔

سوال :۔ مرزا قادیانی نے لکھا ہے جو شخص مجھ پر ایمان نہیں لاتا " خواہ اس کو میرا نام نہیں پہنچا ہو " کافر ہے پکّا کافر۔ دائرہ اسلام سے خارج ہے ——— اس عبارت سے تو ستر کروڑ مُسلمان سب کافر بنتے ہیں ؟

جواب :۔ کافر تو ہیں لیکن چھوٹے کافر ہیں ، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں " کُفرٌ دونَ کفر " کی روایت درج کی ہے ۔

سوال :۔ آگے مرزا نے لکھا ہے " پکّا کافر " ؟

جواب :۔ اس کا مطلب ہے اپنے کفر میں پکّے ہیں ۔

سوال :۔ آگے لکھا ہے " دائرۂ اسلام سے خارج ہے " حالانکہ چھوٹا کفر ملّت سے خارج ہونے کا سبب نہیں بنتا ۔

جواب :۔ دراصل دائرۂ اسلام کے کئی دائرے ہیں اور مختلف کیٹی گریاں ہیں ۔ اگر بعض سے نکل گیا تو بعض سے نہیں نکلا ۔

سوال :۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ جہنّمی بھی ہے ۔

مفتی صاحب بیان کرتے ہیں " ممبروں نے جب یہ سُنا تو سب کے کان کھڑے ہو گئے ۔ کہ اچھا ہم جہنّمی ہیں ۔ اس سے ممبروں کو دھکّا لگا ، وہ سمجھ گئے کہ ہم تو انہیں مسلمان سمجھتے ہیں اور یہ ہمیں کافر قرار دیتے ہیں " ...... اُدھر نیا سوال آیا " کیا مرزا قادیانی سے پہلے کوئی نبی آیا ہے جو اُمتی نبی ہو ؟ کیا صدیق اکبرؓ یا حضرت عمر فاروقؓ اُمتی نبی تھے ؟ جواب تھا " نہیں " ——— قیامت تک کوئی اور

نبی اُمتی آئے گا" ؟ اس کا بھی جواب تھا "نہیں" ـــــــــ اس پر مفتی صاحب نے کہا "پھر تو اس کے مرنے کے بعد آپ کا اور ہمارا عقیدہ ایک ہو گیا۔ جو ہمارا تصور ہے خاتم النبیینؐ کے بارے میں وہی آپ کا بھی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم سمجھتے ہیں۔ تم مرزا قادیانی کے بعد ایسا سمجھتے ہو۔ تو گویا تمہارا خاتم النبیین مرزا غلام احمد ہے اور ہمارے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مرزا ناصر:۔ وہ فنافی الرسول تھے۔ یہ اُن کا اپنا کمال نہیں تھا۔ وہ تو عینِ محمدؐ ہو گئے تھے۔ (معاذ اللہ) ـــــــــ نبی کریم کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی ؟ منکروں کو "ذُرّیۃ البغایا" کہنے کی بات بھی ہوئی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ مرزا قادیانی نے اپنی کتابوں کے بارے میں لکھا ہے۔ تلک کتب ینظر الیھا کل مسلم بعینِ المحبّۃ والمودّۃ وینتفع من معارفھا ویقبلنی ویصدق دعوتی الا ذریۃ البغایا الذین ختم اللہ علیٰ قلوبھم فھم لا یقبلون (ان کتابوں کو ہر مسلم محبت اور مودّت کی آنکھ سے دیکھتا اور ان کے معارف سے نفع اٹھاتا ہے۔ مجھے قبول کرتا اور میرے دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر بدکار عورتوں کی اولاد، وہ لوگ جن کے دلوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہے وہ مجھے قبول نہیں کرتے)

مرزا ناصر:۔ بغایا کے معنیٰ سرکشوں کے ہیں۔

مفتی صاحب:۔ بغایا کا لفظ قرآن میں آیا ہے۔ وما کانت امک بغیاً (اور تیری ماں بدکارہ نہ تھی)

مرزا ناصر:۔ قرآن میں "بغیا" ہے "بغایا" نہیں۔

مفتی صاحب: صرف مفرد اور جمع کا فرق ہے، نیز جامع ترمذی شریف میں اس

مفہوم میں لفظ "بغایا" بھی مذکور ہے۔ البغایا اللّاتی ینکحن انفسہن بغیر بیّنۃ۔ مَیں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ تم اس لفظ (البغیہ) کا استعمال اس معنیٰ (بدکارہ) کے علاوہ کسی دوسرے معنیٰ میں ہرگز نہیں دکھا سکتے۔

یہ جرح تیرہ روز جاری رہی گیارہ دن ربوہ گروپ پر جو مرزا قادیانی کو نبی تسلیم کرتا ہے اور دو دن لاہوری پارٹی پر جو مرزا قادیانی کو مجدّد مانتی ہے، ہر روز آٹھ گھنٹے جرح ہوئی۔ اس طویل جرح و تنقید نے قادیانیت کے بھیانک چہرہ کو بے نقاب کر دیا۔ حزبِ اختلاف نے "ملّتِ اسلامیہ کا مؤقف"[٥] کے عنوان سے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک مطبوعہ دستاویز ارکانِ اسمبلی میں تقسیم کی۔ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت کے ساتھ ایسی کایا پلٹی کہ ممبران قادیانیت کا کماحقہٗ احتساب کرنے پر تُل گئے اور انہوں نے مسٹر بھٹو کو صاف کہہ دیا کہ "آپ ہمارے سیاسی لیڈر ہیں اور یہ دین و مذہب کا معاملہ ہے"[1]

سب کمیٹی

۲۲ اگست کو حزبِ اختلاف کے چھ رہنماؤں مولانا مفتی محمودؒ، پروفیسر غفور، مولانا شاہ احمد نورانی، چوہدری ظہور الٰہی، مسٹر غلام فاروق اور سردار مولا بخش سومرو اور حزبِ اقتدار کے مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ پر مشتمل ایک "سب کمیٹی" کی تشکیل ہوئی۔ "سب کمیٹی" کے ذمّے یہ کام لگا کہ وہ مذاکرات اور افہام و تفہیم کے ذریعے قادیانی مسئلے کا متفقہ حل تلاش کرے۔ ۲۲ اگست سے ۵ ستمبر

---

[٥] راقم کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس دستاویز کی ترتیب میں اس کی کتاب "اقبالؒ اور قادیانی" سے خاصا استفادہ کیا گیا۔

[1] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۷۵ء ص ۴۱ تا ۴۳

کی شام تک اس کے بہت سے اجلاس ہوئے۔ مگر متفقہ حل کی صورت گری ممکن نہ ہو سکی[1]۔ سب سے زیادہ جھگڑا دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کے مسئلے پر ہوا۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو نمائندگی دی گئی ہے، بلوچستان میں ایک، سرحد میں ایک، سندھ میں دو اور پنجاب میں تین سیٹیں، اور چھ اقلیتوں کے نام لکھے ہیں۔ عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی، بدھ اور شیڈول کاسٹ یعنی اچھوت، حزبِ اختلاف کے نمائندگان چاہتے تھے۔ ان چھ کے قطار میں قادیانیوں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اس کے لئے حکومت تیار نہ تھی اور ویسے بھی قادیانیوں کا نام اچھوتوں کے ساتھ پیوست پڑتا تھا۔ پیرزادہ نے کہا "اس کو رہنے دیں"۔ مفتی صاحب بیان کرتے ہیں ہم نے کہا "جب اور اقلیتی فرقوں کے نام فہرست میں شامل ہیں تو ان کے نام بھی لکھ دیں" پیرزادہ نے جواب دیا "اور اقلیتی فرقوں کا ڈیمانڈ تھا۔ اور مرزائیوں کا ڈیمانڈ نہیں ہے" ہم نے کہا "یہ تو تمہاری تنگ نظری ہے۔ اور ہماری فراخدلی کا ثبوت ہے کہ ہم ان کے ڈیمانڈ کے بغیر انہیں ان کا حق دے رہے ہیں[2]" ـــــ ۷؍ ستمبر کو اسمبلی نے فیصلہ سنانا تھا۔ ادھر "سب کمیٹی" ۵؍ ستمبر کی شام تک کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکی۔ چنانچہ ۶؍ ستمبر کی صبح کو مسٹر بھٹو نے مولانا مفتی محمود سمیت سب کمیٹی کے چھ ارکان کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا۔ جہاں دو گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے باوجود بنیادی نقطۂ نظر پر اتفاق رائے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ حکومت کی انتہائی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ اپوزیشن دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کا مسئلہ رہنے دے۔ اپوزیشن سمجھتی تھی اس کے بغیر حل ادھورا رہے گا۔

---

[1] ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ۱۵؍ ستمبر ۱۹۷۴ء ص ۶، ۷

[2] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۷۵ء ص ۴۵

بڑی بحث و تمحیص کے بعد مسٹر بھٹو نے یہ جواب دیا "مَیں سوچوں گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں دوبارہ بلاؤں گا"[1] عصر کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پیرزادہ نے مفتی صاحب سمیت دیگر ارکان کو اسپیکر کے کمرے میں بلا لیا۔ تار دراصل پیچھے سے ہلایا جا رہا تھا۔

اپوزیشن نے اپنا موقف پھر واضح کیا۔ کہ دفعہ ۱۰۶ میں چھ اقلیتی فرقوں کے ساتھ مرزائیوں کی تصریح کی جائے اور بریکٹ میں "قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ" لکھا جائے۔ مسٹر پیرزادہ نے کہا "وہ اپنے آپ کو مرزائی نہیں کہتے، احمدی کہتے ہیں"۔ مفتی صاحب بیان کرتے ہیں ہم نے کہا:

"ہم ان کو احمدی تسلیم نہیں کرتے، احمدی تو ہم ہیں" ہم نے کہا "چلو مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار لکھ دو" پیرزادہ نے نکتہ اُٹھایا۔ "دستور میں کسی شخص کا نام نہیں ہوتا" حالانکہ دستور میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قائدِ اعظمؒ کے نام موجود ہیں اور پھر کچھ سوچ کر بولے: "مفتی صاحب مرزا کے نام سے دستور کو کیوں پلید کرتے ہیں"۔ مسٹر پیرزادہ کا خیال تھا شاید اس حیلے سے مفتی صاحب ٹل جائیں۔ مفتی صاحب نے فوراً جواب دیا "شیطان، ابلیس اور خنزیر و فرعون کے نام بھی تو قرآن میں موجود ہیں۔ اس سے قرآن کی صداقت و تقدس پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا" ——— پیرزادہ لاجواب ہو کر کہنے لگے "ایسا لکھ دو جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں"۔ مفتی صاحب کہتے ہیں، میں نے کہا "بریکٹ بند ثانوی درجہ کی حیثیت رکھتا ہے، صرف وضاحت کے لئے ہوتا ہے۔ یُوں لکھ دو۔ "قادیانی گروپ، لاہوری گروپ" جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں" اس پر فیصلہ ہو گیا[2]

---

[1] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۷۵ء ص ۴۶

[2] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک جنوری ۱۹۷۵ء ص ۴۶

تاریخی فیصلہ

۷ ستمبر ۷۴ء ہماری تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب ۵۳ء اور ۷۴ء کے شہیدانِ ختمِ نبوت کا خون رنگ لایا اور ہماری قومی اسمبلی نے اپنی تاریخ میں پہلی بار ملی امنگوں کی ترجمانی کی اور عقیدۂ ختمِ نبوت کو آئینی تحفظ دے کر قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔

اس روز دستور کی دفعہ نمبر ۲۶ میں اس تاریخی شق کا اضافہ ہوا:

"جو شخص خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت پر مکمل اور غیر مشروط ایمان نہ رکھتا ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی معنیٰ و مطلب یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعویدار ہو یا اس قسم کا دعویٰ کرنے والے کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہو وہ آئین یا قانون کے مقاصد کے ضمن میں مسلمان نہیں ہے[1]"

دفعہ ۱۰۶ کی شکل یوں بنی:

"بلوچستان، پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبوں کی صوبائی اسمبلیوں میں ..... ایسے افراد کے لئے مخصوص فاضل نشستیں ہوں گی جو عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور پارسی فرقوں اور قادیانی گروہ یا لاہوری افراد (جو اپنے آپ کو "احمدی" کہتے ہیں) یا شیڈول کاسٹس سے تعلق رکھتے ہیں —— بلوچستان ایک، سرحد ایک، پنجاب تین، سندھ دو[2]"

ان دستوری ترامیم کے علاوہ یہ تین سفارشات آئیں۔

۱۔ "تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے:

---

[1] ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۷۴ء

[2] ایضاً

"کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ شق نمبر ۳ کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے خلاف اقرار، عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا" ——— تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے تحت ۲ سال قید کی سزا موجود ہے[1]"

۲۔ "متعلقہ قوانین مثلاً نیشنل رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء میں قانون سازی اور ضابطے کے ذریعے ترامیم کی جائیں"[2]

تیسری سفارش عمومی نوعیت کی تھی جس میں دستور میں پہلے سے دی گئی ضمانت کو دہراتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، کے جان، مال، آزادی، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا"[2]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی ان آئینی ترامیم کے حق میں ایک سو تیس ووٹ آئے۔ جبکہ مخالفت میں ایک ووٹ بھی نہ ڈالا گیا[3]

مبارک باد

اس تاریخی فیصلے کے اعلان کے بعد اسمبلی کے ایوان میں تمام اہم رہنماؤں نے اپنے تاثرات بیان کیے۔

مفتی صاحب نے کہا:

---

[1] ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۷۴ء

[2] ایضاً

[3] ایضاً

"اس فیصلے پر پوری قوم مبارک باد کی مستحق ہے اس پر نہ صرف پاکستان بلکہ عالمِ اسلام میں اطمینان کا اظہار کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے مرزائیوں کو بھی اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ اب انہیں غیر مُسلم اقلیت کے جائز حقوق ملیں گے۔ جہاں تک کریڈٹ کا سوال ہے یہ مسئلہ قومی بنیادوں پر تمام تر سیاسی اختلافات سے بالاتر ہو کر طے کیا اس مسئلے کے حل میں ارکانِ قومی اسمبلی اور سینیٹ نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا ـــــ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجلس عمل نے پُر وقار جدّو جہد جاری رکھی حالانکہ فائرنگ ہوئی لوگ شہید ہوئے لاٹھی چارج، گرفتاریوں اور تشدّد کے تمام واقعات کے باوجود خود ردِّ عمل کا شکار ہو کر تشدّد کا راستہ اختیار نہ کیا۔ سیاسی طور پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اُلجھے ہوئے مسائل کا حل بندوق کی گولی میں نہیں مذاکرات کی میز پر ہے[1]"

---

[1] ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ۱۵، ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۷

اٹھارہواں باب

پارلیمانی حزبِ اختلاف کی قیادت

مولانا مفتی محمود کو جن حالات میں اسمبلی کے اندر حزبِ اختلاف کی قیادت کرنا پڑی ماضی کا شاید ہی کوئی قائد حزبِ اختلاف ان سے دوچار ہوا ہوگا —— تب مسٹر بھٹو کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا، ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق عبدالصمد اچکزئی اور مولانا شمس الدین ایسے لوگوں کو "نامعلوم قاتلوں" کی گولیاں اور بم چاٹ چکے تھے۔ کئی "جغادری سیاستدان" سیاست سے توبہ کرکے "سرکار کے ملازم" ہو چکے، اور جنہوں نے توبہ نہ کی وہ جیل کی ہوا کھا رہے تھے —— اسی دوران (فروری ۷۵ء) میں پشاور یونیورسٹی میں ایک انتہائی طاقتور ڈائنامیٹ کا دھماکا ہوا اور صوبہ سرحد کے سنیئر وزیر اور پیپلز پارٹی کے صوبائی سربراہ مسٹر حیات محمد خان شیرپاؤ اس کی نذر ہو گئے —— ملک کے تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں نے اس وحشیانہ قتل کی شدید مذمت کی اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا —— حکومت نے اس مطالبہ کی تکمیل کی بجائے، اس المناک واقعے کو اپنے مذموم سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا اور اپنے سب سے

طاقتور سیاسی حریف اور قومی اسمبلی میں متحدہ حزبِ اختلاف کے سربراہ خان عبدالولی خان کو گرفتار کر لیا ـــــــ یہ تھے وہ حالات جن میں متحدہ حزبِ اختلاف کی نگہِ انتخاب مولانا مفتی محمود پر پڑی، اور انہیں قائم مقام قائد حزبِ اختلاف چُنا گیا!

مفتی صاحب نے جس ہمت اور تدبّر کے ساتھ "ایول جینیس" بھٹو کا مقابلہ کیا اور جس چابکدستی سے اس کے انتہائی گھناؤنے آمرانہ ذہن کو پوری قوم اور بیرونی دنیا کے سامنے منکشف (EXPOSE) کیا، وہ قابلِ داد ہی نہیں قابلِ صد داد ہے۔ انہوں نے توازن، شائستگی اور بردباری کے امتزاج کے ساتھ اپنے تدبّر اور استقامت کا لوہا دوست تو دوست، دشمن تک سے منوا لیا ـــــــ اور آج اُن کا کردار ہماری پارلیمانی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس پر آنے والی نسلیں یقیناً فخر کر سکیں گی۔

نو ماہی بائیکاٹ

مرحوم ایوب خاں اسمبلی کی حد تک اپوزیشن کی تُند و تیز تقریریں پھر سُن لیتے، مگر بھٹو صاحب کی طبعِ نازک اس کی روادار بھی نہ تھی۔ حالانکہ محبِ وطن اپوزیشن نے ہر آڑے وقت پر ان کی حکومت سے خاصا تعاون کیا۔ آئین کی تدوین، اس کی منظوری، معاہدہ شملہ کے وقت اختلاف کے باوجود پورا پورا تعاون، بار بار آئین و قانون کی خلاف ورزیوں کے باوجود سیاسی مذاکرات، لیکن اس سب کچھ کے باوجود مسٹر بھٹو نے اپوزیشن کو مان کر نہ دیا ـــــــ اور مسلسل اس کی تذلیل و تحقیر اور سرکوبی میں لگے رہے۔

اپوزیشن نے جب اسمبلی کے اندر بار بار مسٹر بھٹو کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کا متکبّرانہ انداز مشاہدہ کیا تو "تنگ آمد

"بجنگ آمد" کے مصداق پہلے تو احتجاجی واک آؤٹ کا "اسلحہ" استعمال کیا۔ جب اسے "بے اثر" دیکھا تو بائیکاٹ پر آ گئی ـــــــ ایک دفعہ جو بائیکاٹ شروع ہوا تو نو ماہ سے بھی زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ (غالباً جنوری ۷۵ء تا اکتوبر ۷۵ء) سینٹ میں قومی اسمبلی میں اور دیگر تمام اسمبلیوں میں اپوزیشن کے بنچ خالی رہے۔ پارلیمانی تاریخ کا (میری معلومات کی حد تک) یہ طویل ترین بائیکاٹ تھا۔ مسٹر بھٹو کی حکومت کی جگہ کوئی اور حکومت ہوتی تو اپوزیشن کے چرکوں سے نیم جان ہو جاتی مگر یہاں مقابلہ بڑے "سخت جان" سے تھا۔ بقول مفتی صاحب "ایسے بے حیا لوگوں سے واسطہ پڑا کہ نو ۹ ماہ کے بائیکاٹ کے باوجود شرم کا ایک قطرہ اُن کے ماتھے پر نہ آیا[۵۱]"

اگرچہ بعض حلقوں نے اسقدر طویل بائیکاٹ سے اختلاف کیا اور اسے غلط بتایا مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ فیصلہ درست تھا۔ اس طویل بائیکاٹ کے تین فائدے ہوئے اوّلاً پیپلز پارٹی کے اندرونی تضادات اُبھرے اور اس کے اندر دراڑیں پڑیں۔ پی پی پی کے کئی ارکانِ اسمبلی نے ـــــــ عملاً حزبِ اختلاف کا رول ادا کرنا شروع کر دیا۔ ثانیاً عوام کے ذہن میں یہ بات واضح ہو گئی کہ مسٹر بھٹو اپنے سوا کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اس سے ان کے عوامی امیج کو دھکا لگا۔ ثالثاً بیرونی دنیا میں مسٹر بھٹو کا باطن ظاہر ہوا۔ اور وہاں ان کی جمہوریت پسندی کا پول کھل گیا۔

ان تینوں فوائد کو حاصل کرنے کے بعد اپوزیشن نے مسٹر بھٹو سے نہایت شدت کے ساتھ سیاسی لڑائی لڑنے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۲ر اکتوبر کو متحدہ جمہوری محاذ کی مجلسِ عاملہ نے نو ماہی بائیکاٹ کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ بائیکاٹ کے خاتمہ کے بعد "متحدہ جمہوری محاذ" نے نہایت

---

[۵۱] ہفت روزہ "اداکار" لاہور۔ ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء ص ۱۲۔

جارحانہ انداز میں اپنی تحریک اٹھائی۔ مفتی صاحب نے ۲۶ر اکتوبر کو گوجرانوالا میں نظامِ شریعت کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے ایک معرکہ آراء تقریر کی اور واضح کیا: "متحدہ محاذ کی میٹنگ میں بائیکاٹ ختم کرنے کا جو فیصلہ ہوا اس کا مطلب یہ نہیں کہ بائیکاٹ ختم ہو گیا۔ اب ہم نئے طرز کی تحریک شروع کرنے والے ہیں، عوامی تحریک شروع کرنے والے ہیں[1]"

شرمناک کارروائی

۱۴ر نومبر کو چھوٹی سی اپوزیشن حکومت کیلئے مسئلہ بن گئی۔ حکومت آئین میں چند اہم ترامیم کرکے عدالتوں کے اختیارات محدود کرنا چاہتی تھی چنانچہ اُس نے من مانی کرنے کیلئے خلافِ ضابطہ یہ ترمیمی بِل بغیر کسی نوٹس کے ایوان میں پیش کر دیا۔ اپوزیشن نے اس پر شدید مزاحمت کی۔ اس کا کہنا تھا۔ ہمیں ترمیمی بِل پر غور کرنے اور ترامیم پیش کرنے کے لئے مناسب وقت دیا جائے۔ قریباً پون گھنٹے تک ایوان میں اس مسئلے پر زبردست ہنگامہ رہا۔ اور اپوزیشن نے سرکاری بنچوں کو کوئی کارروائی نہ کرنے دی۔ اس کا حل اسپیکر نے یہ سوچا کہ اپوزیشن کے تین ارکان چودھری ظہور الٰہی وغیرہ کو ایوان سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ مگر ان ارکان نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ جب اس سے بات نہ بنی تو "سارجنٹ ایٹ آرمز" کو طلب کیا گیا کہ ان سے ہماری جان چھڑاؤ۔ اس کے ساتھ ہی اسپیکر نے اجلاس شام چھ بجے تک ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس دوران "سارجنٹ ایٹ آرمز" نے اپوزیشن کو باہر نکالنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ادھر جماعت اسلامی کے صاحبزادہ صفی اللہ نے اٹھ کر مغرب کی اذان دینا شروع کر دی۔ ایوان

---

[1] ہفت روزہ "اداکار" لاہور ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء

کے اندر ہی دری بچھی اور جماعت کھڑی ہو گئی۔ مولانا مفتی محمود امام، چوہدری ظہور الٰہی ڈاکٹر غلام حسین، ملک محمد سلیمان، مولانا عبدالحق، ذوالفقار علی باجوہ، صاحبزادہ صفی اللہ پروفیسر غفور اور مخدوم نور محمد مقتدی۔ بعد میں مولانا غلام غوث ہزاروی بھی آ کر جماعت میں شامل ہو گئے۔

نماز ادا کرنے کے بعد اپوزیشن کے تمام ارکان ایوان میں بیٹھ گئے۔ لیکن اجلاس پروگرام کے مطابق شام چھ بجے شروع نہ ہوا۔ شروع ہوتا بھی کیسے؟ "دشمن جان" تو اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران ایف ایس ایف کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس نے اپوزیشن ارکان کو زبردستی مُکّے، ٹھڈے اور دھکے مار کر باہر نکالا، اکیلے چوہدری ظہور الٰہی کو چھ افراد نے اٹھا کر باہر پھینکا۔ یہی عمل پروفیسر غفور کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ مفتی صاحب جو صرف اسمبلی ممبر یا اپوزیشن لیڈر ہی نہ تھے بلکہ ملک کے ممتاز عالم دین اور مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے انتہائی قابلِ احترام تھے "ڈیرے ہٹم" حکومت نے انہیں بھی دھکے دلوا کر باہر نکالا۔ مفتی صاحب جب سیڑھیاں اُترتے ہوئے وزیر اعظم چیمبرز کے سامنے آئے تو مسٹر بھٹو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ مفتی صاحب وہیں چیمبرز کے سامنے سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ گویا کہہ رہے ہوں ؎

خدا ترا بُتِ کم سِن دراز سِن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

مفتی صاحب، ظہور الٰہی اور ایک اور رکن کو اس ہنگامے میں زخم بھی آئے۔

جب اخبارات میں جفا کی یہ کہانی چھپی تو پڑھنے والوں کو افسوس بھی ہوا، پریشانی بھی، اور ہونٹوں پر خندۂ استہزا بھی ابھرا۔ دانا لوگوں کا کہنا تھا "مسٹر بھٹو اس طرح آخر کب تک حکومت کر سکیں گے؟" جو بات لوگ سوچ رہے تھے۔ وہ دراصل خود مسٹر بھٹو کے سوچنے کی تھی۔ بہر حال حکومت کے اس طرزِ عمل سے

قطعی واضح ہوگیا کہ وہ کیا ہے ؟ اور اپوزیشن بار بار اسمبلی کا بائیکاٹ کیوں کرتی ہے ؟

قاتلانہ حملہ

اپریل کی ۲۲ ر تاریخ اور دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے ۔ جب مفتی صاحب کا سات گاڑیوں پر مشتمل قافلہ حیدرآباد سے ۸۰ میل دور ضلع ٹھٹھہ کے علاقے سجاول کے نزدیک پہنچا ۔ قریب ہی آمراگوٹھ واقع ہے ۔ کچھ افراد جو لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور پستولوں سے مسلح تھے اس مقام پر پہلے ہی ایک جیپ میں سوار ہوکر پہنچ چکے تھے ۔ جیپ ر ٹی لے ۴۸۱) سڑک کے کنارے کھڑی تھی ۔ ایک کے سوا باقی افراد قریب کی جھاڑی کی آڑ میں چلے گئے ۔ سڑک پر جیپ کے ساتھ موجود تنہا شخص نے مفتی صاحب کی گاڑی پہنچتے ہی انہیں ہاتھ دے کر روکا ۔ تاثر یہ تھا کہ وہ بھی استقبال کرنے والوں میں سے ہے ۔ اور یہی تاثر قبول بھی کیا گیا ۔ لہذا قافلہ ٹھہرا دیا گیا ۔ قافلے میں آگے ایک جیپ ر کے لے کے (۱۸۳) تھی جونہی گاڑیاں ٹھہریں نقشہ بدل گیا ۔ قریب کی جھاڑی سے مسلح حملہ آور نکل آئے ۔ ان کی کلہاڑیوں، ڈنڈوں اور فائرنگ کا پہلا نشانہ جیپ بنی ۔ اور پھر چشم زدن میں مفتی صاحب کی کار ان کی زد میں تھی ۔ حسن اتفاق سے مفتی صاحب کی کار کا ڈرائیور حاضر دماغ اور غیر معمولی ہوشیار تھا ۔ وہ کمال پھرتی سے کار کو حملہ آوروں کے نرغے سے نکال لے گیا ـــــ مفتی صاحب کے بچ نکلنے پر ملزمان فرار ہوگئے ۔ یہ حملہ پیپلز پارٹی سجاول کے ایک سربرآوردہ کارکن کی زیر قیادت کیا گیا ۔ مفتی صاحب کے ایک رفیق سفر محمد رحیم ڈنو اس حملے میں ٹانگ میں گولی لگنے سے شدید زخمی ہوئے ۔ مفتی صاحب کو قدرت نے بال بال بچا لیا ۔

ہنگامی پریس کانفرنس

اسی شب ساڑھے آٹھ بجے سجاول میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مفتی صاحب نے اپنے اوپر کئے جانے والے قاتلانہ حملے کی تفصیلات بتائیں اور کہا :

"میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسی مذموم حرکتیں حزب اختلاف کی آواز کو دبانے کے لئے پہلے بھی کی جاتی رہی ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ آج ملک میں کسی شخص کی زندگی محفوظ نہیں[1]۔" ان کی اس پریس کانفرنس کے ناطے سے ۱۳ر اپریل کے اخبارات میں قاتلانہ حملے کی خبر چھپی، جسے بعد ازاں بی۔ بی سی، آل انڈیا اور کابل ریڈیو نے بھی نشر کیا۔

دوسری کوشش

اسی دوران مفتی صاحب کو نقصان پہنچانے کی ایک اور کوشش ہوئی۔ ۱۳ر اپریل کو مفتی صاحب کراچی جانے کے لئے سجاول سے ٹھٹھہ روانہ ہوئے۔ جونہی ان کا قافلہ روانہ ہوا۔ کچھ افراد کاروں میں تعاقب پر مامور ہوئے، جب مفتی صاحب کا قافلہ سجاول پل کے نزدیک پہنچا تو پیچھے سے آنے والی کاروں نے "اوورٹیک" کے بہانے مفتی صاحب کی کار کو ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ جس سے وہ الٹتے الٹتے بچی۔ ایک ڈی ایس پی کی ہمراہی میں پولیس کا دستہ بھی ساتھ چل رہا تھا۔ ڈی ایس پی جو کوئی شریف آدمی تھا، اس نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے دو مرتبہ مفتی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی گاڑیوں کو روکا تاکہ ملزمان آگے نکل جائیں۔ اور

---

[1] ہفت روزہ "اداکار" لاہور ۴ر مئی ۱۹۷۵ء ص ۱۱

"اوورٹیک" کے بہانے "ٹکر" مارنے کی کوشش نہ کریں۔ ساتھ ہی ڈی ایس پی نے مفتی صاحب کو آہستہ چلنے کا مشورہ دیا۔ دیکھنے والوں نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ ان کاروں میں بھی پیپلز پارٹی کے کارکن موجود تھے۔

ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے اس دوسرے حملے کی کوشش کے بارے میں استفسار پر اخباری نمائندوں کو بتایا۔ "وہ (ملزمان) تو محض گزر رہے تھے، حملے کی نیت سے نہیں گئے تھے۔"[لہ] گویا موصوف "ملزمان" کے "گزرنے" کا علم رکھتے تھے۔

[لہ] ہفت روزہ "اداکار" لاہور ۴ مئی ۱۹۷۵ء ص ۱۱۔

انیسواں باب

پاکستان قومی اتحاد، بے مثال جِدّ و جُہد

طوفان آنے سے پہلے ہوا ایکا ایکی رُک جاتی ہے۔ نادان اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ دانا سمجھ جاتے ہیں کہ طوفان اُٹھنے والا ہے۔

۷۷ء کے شروع تک ملک بھر میں مسٹر بھٹو کا طوطی بول رہا تھا۔ ٹرسٹ کے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی ”بھٹو عظیم اور ناقابلِ تسخیر ہے“ کے زمزمے الاپ رہے تھے۔ خود غرض لوگ جو کسی ٹہنی کا پتہ نہیں ہوتے اپوزیشن سے ٹوٹ ٹوٹ کر بھٹو صاحب کی گود میں گر رہے تھے۔ پاکستان بظاہر ایک ایسا طلسمات تھا۔ جہاں ہر طرف بھٹو ہی بھٹو نظر آتا تھا۔ لوگوں کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ وہ کہتے تھے اب بھٹو سے کسی صورت پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔

مولانا مفتی محمود نے ایک زیرک سیاستدان کی طرح اس فضا کے پس پردہ عوامل کو بھانپتے ہوئے مسٹر بھٹو کو بار بار چیلنج دیا۔

”تم پندرہ دنوں کے لئے پابندیاں ہٹا دو۔ دفعہ ۱۴۴ ختم کرو، اگر لوگوں نے تمہارا تختہ نہ اُلٹ دیا تو میں سیاست ترک کر دوں گا۔“

مسٹر بھٹو کو بتایا گیا یہ محض تعلّیاں ہیں۔ اپوزیشن میں اب کوئی دم خم نہیں رہا۔ نیپ ختم ہو چکی ہے۔ باقی ماندہ اپوزیشن کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ یہ لوگ کسی طور بھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ عوام کی نظروں میں ان کا کوئی وقار نہیں۔ اس دوران مسٹر بھٹو نے سرکاری ذرائع سے پورے ملک میں اپنے حق میں انتخابی مہم چلائی، بلکہ وہ ایک ہوشیار سیاستدان کی طرح یہ مہم برسرِاقتدار آنے کے بعد سے ہی چلا رہے تھے۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب میدان اُن کے ہاتھ میں رہے گا تو جنوری ۷۷ء کے شروع میں انہوں نے مارچ کی سات تاریخ کو ملک بھر میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔

اتحاد کی تشکیل

۱۱ر جنوری کو تمام اپوزیشن پارٹیوں کے رہنما لاہور میں جمع ہوئے۔ اور اڑتالیس ۴۸ گھنٹے کے غور و خوض اور مشورت کے بعد انہوں نے "پاکستان قومی اتحاد" (P.N.A) کے نام سے ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مولانا مفتی محمود صدر اور رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس محاذ میں یہ نو سیاسی اور دینی جماعتیں شامل ہوئیں۔ جمعیتہ علماء اسلام، پاکستان مسلم لیگ، جمعیتہ علماء پاکستان، تحریک استقلال، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، جماعت اسلامی، پاکستان جمہوری پارٹی، خاکسار تحریک اور مسلم کانفرنس، ان جماعتوں کے جو مرکزی لیڈر شریک اجلاس ہوئے وہ تھے مولانا مفتی محمود، ملک محمد قاسم، مولانا شاہ احمد نورانی، ائر مارشل اصغر خاں، پروفیسر عبدالغفور، نوابزادہ نصراللہ خان، محمد اشرف خان اور سردار اسکندر حیات، انہوں نے آپس میں ہر حال میں ایک رہنے کا عزم اور عہد کرتے ہوئے ایک جھنڈے ایک منشور اور ایک ہی انتخابی نشان کے تحت

الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ پیپلز پارٹی کا پرچم سرخ، سبز اور سیاہ تین رنگوں میں تھا۔ پی۔ این۔ اے نے سبز رنگ کے پرچم پر نو ستارے بنا کر تمام جماعتوں کی نمائندگی کر دی۔ اور مسٹر بھٹو کی تلوار کے مقابلہ میں ہل انتخابی نشان منتخب کیا۔ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ یہ "بھان متی" کا کنبہ ہے۔ اول تو عہدیداروں پر لڑے گا، نہیں تو منشور اور جھنڈے پر لڑائی ہو جائے گی۔ یہ نہ ہوا تو سیٹوں کے مسئلہ پر یہ ضرور جھگڑ پڑیں گے۔ مگر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپوزیشن نے ایک ایک کر کے یہ تمام مرحلے خوش اسلوبی سے طے کر لیے۔

منشور

"پاکستان قومی اتحاد" میں شامل تمام جماعتوں کا اتحاد باہمی دو بنیادی عوامل کا رہینِ منت تھا۔ اولاً نظامِ اسلام ثانیاً بھٹو شاہی سے چھٹکارا چنانچہ پاکستان قومی اتحاد نے اپنے منشور میں عہد کیا کہ وہ قرآن و سنّت کی مکمل پابندی کرے گا اور ہر مسلمان کو اس قابل بنائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تقاضوں کے مطابق بسر کر سکے۔ اُس نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ پاکستان میں ایک ایسی حقیقی جمہوری حکومت کا قیام عمل میں لائے گا جس میں ملک کے باشندے کاروبارِ حکومت میں شریک ہو سکیں اور اپنی آزاد مرضی سے حکومت منتخب بھی کر سکیں اور ہٹا بھی سکیں۔ تاکہ آمریت کی ہر شکل کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے[۱]۔

اتحاد نے ملکی و قومی مسائل مثلاً تعلیم، دفاع، امورِ خارجہ، معیشت، زراعت، تجارت، صحت، لیبر، غیر مسلم اقلیتوں اور دستور و ملکی قوانین کے سلسلہ میں پیپلز پارٹی کی بہ نسبت کہیں زیادہ جامع، پُرکشش اور قابلِ عمل منشور پیش کیا۔ پاکستان

---

[۱] "منشور پاکستان قومی اتحاد" عنوان "مقاصد"

کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کی تمام سیاسی و دینی جماعتیں ایک ایسے منشور کی بنیاد پر الیکشن لڑ رہی تھیں، جس کی اساس اسلام کے سچے اصولوں پر تھی۔ یہی وجہ ہے جو لوگوں میں پی این اے کو بے مثال پذیرائی حاصل ہوئی۔

تاریخی دھاندلی

انتخابات میں حکومت کی طرف سے دھاندلی کے تمام تر امکانات کے باوجود (اور وزیر اعظم اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے بلا مقابلہ انتخاب نے ان امکانات پر مہر توثیق ثبت کر دی تھی) لوگ یہ خیال کرتے تھے "پاکستان قومی اتحاد" خاصی نشستیں جیت لے گا۔ خود حکمران جماعت کے ذمہ دار افراد یہ تعداد ساٹھ سے اوپر قرار دیتے رہے۔ "پاکستان ٹائمز" کا اندازہ تھا پی این اے کو ستر نشستیں مل جائیں گی۔

اپوزیشن کا الزام تھا مسٹر بھٹو نے ہر ضلع کے حاکم کو ہدایت کی ہے کہ وہ پیپلز پارٹی کے تین ۳ نمائندے بہر طور اپنے ضلعے سے کامیاب کرائے۔ اس پروگرام پر عملدرآمد کا مطلب تھا۔ پاکستان قومی اتحاد کو ہر ضلعے سے ایک ایک سیٹ مل جائے گی۔ گویا پنجاب میں کُل انیس 19 بیس ۲۰ سیٹیں۔ لیکن ہوا یہ کہ پنجاب اور سندھ میں متحدہ اپوزیشن پر جھاڑو ہی پھر گئی۔ ابھی بیلٹ بکسوں میں پڑے ہوئے ووٹوں کی گنتی بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ۷ مارچ کی شام نتائج کا اعلان ہونا شروع ہو گیا۔ وہ شہر جہاں سے نتائج جلد "نیوز ڈیسک" تک پہنچ سکتے تھے۔ اُن کا تو ذکر تک نہ ہوا۔ مگر وہ دُور دراز علاقے جہاں سے نتائج آنے کے لئے خاصا وقت درکار تھا۔ وہاں کے نتائج ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہونے لگے۔ یہ ڈرامہ اس چابکدستی سے اسٹیج کیا گیا کہ لوگ بھونچکا رہ گئے۔ ۸ مارچ کی صبح لوگوں کے دل اس قدر بجھے ہوئے تھے۔ کہ وہ نتائج پر کسی طرح کی گفتگو کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب

کھا رہے تھے۔ پی این اے کا ہاتھ لوگوں کی نبضوں پر تھا۔ اُس نے ان بوگس نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے ۱۰؍ مارچ کے صوبائی انتخابات کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ لوگوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا خاموش راستہ ہاتھ آ گیا۔ ۱۰؍ مارچ کو پولنگ اسٹیشنوں کا یہ حال تھا کہ وہاں "اُلّو بول رہے تھے" اس طرح حکومت کی بے مثال دھاندلی تمام دنیا پر بے نقاب ہو گئی۔

مولانا مفتی محمود کی کامیابی

مولانا مفتی محمود اپنے آبائی وطن ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے علاوہ اس دفعہ پنجاب سے ملحق ڈیرہ غازی خاں سے بھی کھڑے ہوئے۔ یہ شاید پنجاب میں اُن کا "ٹرائل بال" تھا۔

مسٹر بھٹو ۷۰؍ کے الیکشن میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی سیٹ پر مولانا مفتی محمود سے تیرہ ہزار ووٹوں سے ہزیمت اُٹھا چکے تھے۔ انہیں اس کا بدلہ چکانا تھا۔ چنانچہ بقول ایئر مارشل اصغر خاں انہوں نے ایک ایسے صنعتکار کو پارٹی ٹکٹ دیا۔ جس نے مفتی صاحب کے خلاف الیکشن میں ایک کروڑ روپیہ خرچ کا وعدہ کیا تھا۔

مفتی صاحب نے الیکشن کے روز ڈیرہ بیٹھ کر اپنی مہم کو کنٹرول کیا۔ انہیں دوپہر کو ہر طرف سے اطلاع مل گئی کہ وہ جیت گئے ہیں۔ شام کو یہ خبر بھی اُن تک پہنچ گئی کہ نتائج مرتب کر کے آگے بھجوانے والا عملہ اُن کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔ انہوں نے اس وقت متعلقہ عملے کو فون کیا وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر ڈی۔ سی اور کمشنر سے بات کی۔ انہوں نے بتایا "ہمیں کچھ معلوم نہیں" کارکن دوڑائے گئے کہ عملے کو تلاش کرو۔ اگر انہیں ملنا ہوتا تو وہ "گم" ہی کیوں ہوتے؟ مفتی صاحب نے فوراً الیکشن کمشنر سے بات کی۔ اور اُنہیں تمام کہانی سنا دی۔

الیکشن کمشنر نے اُسی وقت ریڈیو سے مفتی صاحب کی واضح اکثریت کے ساتھ کامیابی کا اعلان کرا دیا ـــــــ اور وہ نیوز بلیٹن تو اکثر قارئین کو یاد ہوں گے جن میں نیوز کاسٹر’’ (NEWS CASTER) پہلے مفتی صاحب کے چند سَو ووٹ نشر کرتا اور پھر کہتا ’’ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پی این اے کے مولانا مفتی محمودؒ نے اتنے ہزار اتنے سَو اتنے ووٹوں کی اکثریت حاصل کر لی ہے اور وہ قریب قریب منتخب ہو گئے ہیں‘‘ ’’ریڈیو پاکستان‘‘ کا یہ تضاد حکومت کی ’’دھاندلی‘‘ کا مُنہ بولتا ثبوت تھا۔ ـــــــ یہی کچھ ڈیرہ غازی خاں میں ہوا، لیکن اللہ ربّ العزت نے مولانا مفتی محمودؒ کو تمام تر دھاندلی کے باوجود دونوں جگہ کامیابی عطا فرمائی اور حق کا بول بالا کر دیا۔ ’’پاکستان قومی اتحاد‘‘ کو پنجاب، سندھ اور سرحد میں کل ۳۷ نشستیں حاصل ہوئیں۔ جبکہ بلوچستان میں اُس نے سرے سے الیکشن میں حصّہ ہی نہ لیا۔

تاریخ ساز احتجاجی تحریک

’’پاکستان قومی اتحاد‘‘ کے لیڈر عوام کے اندر رہ رہے تھے اور مسٹر بھٹو پرائم منسٹر ہاؤس میں۔ اوّل الذکر نے عوام کے دلوں میں اُٹھنے والی طوفانی لہروں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جبکہ مسٹر بھٹو زبردست ٹھوکر کھا گئے۔ یہی وجہ ہے متحدہ اپوزیشن نے جب ۱۰ مارچ کے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تو پشاور سے کراچی تک عوام نے اُن کا بھرپور ساتھ دیا۔ لوگوں کے جذبات اتنے گرم تھے کہ وہ محض بائیکاٹ پر قانع نہ رہنا چاہتے تھے۔ پاکستان قومی اتحاد نے اس تقاضے کو بھانپتے ہوئے بوگس نتائج کے خلاف ملک بھر میں عام ہڑتال کی اپیل کی جسے بے مثال پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ مطالبات

اُٹھائے :

۱۔ مسٹر بھٹو مستعفی ہو جائیں ۔ ۲۔ چیف الیکشن کمشنر مستعفی ہو جائیں ۔ ۳۔ اور انتخابات دوبارہ کرائے جائیں ۔ اور پھر ان مطالبات کے حق میں یکے بعد دیگرے کئی عام ہڑتالیں کرائیں، ملک بھر میں دفعہ ۱۴۴ کی پابندیوں کو توڑتے ہوئے جلوس نکالے اور گرفتاریاں دینے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے ساتھ ہی "پاکستان قومی اتحاد" کے تمام نومنتخب ارکان احتجاجاً قومی اسمبلی کی رُکنیت سے مستعفی ہو گئے ۔ "پاکستان قومی اتحاد" کے ہر اقدام اور فیصلے کو اس کی توقع اور اندازے سے کہیں زیادہ عوامی تائید و حمایت حاصل ہوئی ۔ "پاکستان قومی اتحاد" کے تمام مرکزی رہنماؤں نے مختلف شہروں میں گرفتاریاں پیش کیں، لوگ اتحاد کے لیڈروں پر پروانہ وار گر رہے تھے ۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک ایک ہیبت ناک طوفان کی شکل اختیار کر گئی، جس کے سامنے مسٹر بھٹو کی حکومت کاغذ کی ناؤ کی طرح ہچکولے کھانے لگی ۔ انتظامیہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس طوفانی مدوجزر پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی ۔ جس پر مسٹر بھٹو نے تشدد کے ساتھ اس تحریک کو دبانے کا فیصلہ کیا ۔ اور گورنر ہاؤس لاہور میں اپنے پارٹی کارکنوں کو تشدد کی شہ دی ۔ اس سے اگلے روز رتن سینما اور لاہور ہوٹل کی عمارت سے مسٹر بھٹو کا پڑھایا ہوا سبق عملاً دہرایا گیا ۔ لاہوریے "مسلم مسجد" کے المناک سانحہ کے بعد بھرے بیٹھے تھے وہ بھی مرنے مارنے پر تل گئے ۔ نتیجتاً لاہور میں وہ ہوش رُبا معرکہ لڑا گیا جس کی تفصیلات ایک الگ باب کی متقاضی ہیں ۔ یہی کچھ کراچی، حیدرآباد، ملتان، لائلپور اور سیالکوٹ میں ہوا ۔ حکومت کو ہر جگہ مُنہ کی کھانا پڑی ۔ عوام کو جب اپنے موقف کی صداقت پر یقین ہو تو پھر یہی ہوتا

کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں دبا نہیں سکتی۔ ود اندازے کے مطابق ایک ہزار افراد نے اس تحریک میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ہزاروں افراد زخمی ہوئے۔ کراچی، حیدرآباد اور لاہور میں مارشل لاء لگانا پڑا۔ ملتان، لائل پور، سیالکوٹ اور چنیوٹ وغیرہ میں کرفیو نے پاؤں جمائے۔

مفتی صاحب ہری پور جیل میں

اس دوران حکومت نے مفتی صاحب کو تین دفعہ گرفتار کیا۔ آخری بار ڈی پی آر کے تحت لاہور سے گرفتار کر کے پہلے پنڈی اور پھر ہری پور جیل میں رکھا گیا۔ اللہ والوں کی اپنی شان ہوتی ہے۔ جیل میں ہوں یا جیل سے باہر اُن کے روز و شب اللہ کے دین اور اس کی مخلوق کی خدمت ہی میں بسر ہوتے ہیں۔ "ہری پور جیل" میں اللہ نے اپنے بندوں کو مفتی صاحب کے وجود سے بہت نفع پہنچایا۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور بقول مفتی صاحب "ہری پور جیل" جیل نہیں دارالعلوم بن گیا" مفتی صاحب کے صاحبزادے مولوی فضل الرحمٰن متعلم "دارالعلوم حقانیہ" اور دارالعلوم کے کئی اسیر طلبہ نے مفتی صاحب سے "مشکوٰۃ شریف" "ہدایہ" اور "سراجی" کا درس شروع کیا۔ جس میں اور بھی کافی علماء اور زعماء بیٹھتے، اس کے بعد دو چار گھنٹے مفتی صاحب ترمذی شریف کی عربی شرح لکھتے۔ عصر کے بعد کھلی گراؤنڈ میں مفتی صاحب نے حدیث کا عمومی درس شروع کیا۔ دو ایک دن بعد انتظامیہ نے اپنی دشواریاں ظاہر کیں۔ اور درس رُکوا دیا۔ جیل میں نمازِ جمعہ کی اجازت نہ تھی، مفتی صاحب نے جیل میں نمازِ جمعہ کے جواز کے دلائل کو نہایت واضح طور پر پیش کیا۔ جس پر انتظامیہ کو اجازت دینا پڑی۔

مفتی صاحب جمعہ بھی پڑھاتے اور تقریر بھی کرتے جس سے ساری جیل کے سیاسی اور اخلاقی قیدیوں کی عظیم تربیت ہونے لگی۔ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ابھی تین خطبات آپ نے دیئے تھے کہ آپ کو سہالہ منتقل کر دیا گیا۔[1]

بے نتیجہ خط کتابت

اس دوران مسٹر بھٹو نے مولانا مفتی محمود کے ساتھ خط کتابت کے ذریعہ مسئلہ گول کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر بھٹو نے ۱۱ اور ۱۲ مارچ کی درمیانی رات کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔ قومی اسمبلی کے انتخابات ہو چکے ہیں۔ اُن کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ اپوزیشن ہار چکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ صوبائی انتخابات کے سلسلہ میں بات ہو سکتی۔ اپوزیشن کو معقولیت کی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی ۱۳ مارچ کو ذیل کا خط ایک سرکاری پیغامبر کی معرفت مفتی صاحب کو بھجوایا۔

پرائم منسٹر ہاؤس
راولپنڈی

۱۳ مارچ ۱۹۷۷ء

میرے پیارے مفتی صاحب!

کل رات میں نے ریڈیو اور ٹیلیویژن پر تقریر کرتے ہوئے آپ کو اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے جو دعوت دی تھی۔ آپ کو یہ خط اسی سلسلہ میں تحریر کر رہا ہوں۔ میں اب آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کا جواب اثبات میں ہوگا۔ جواب دیتے وقت آپ کے ذہن میں قوم کا وسیع تر

---

[1] ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک ج ۱۲ ش ۷، ۸ ص ۶۰

مفاد ہوگا۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ میری طرف سے یہ مذاکرات خلوص نیت اور کھلے دل کے ساتھ ہوں گے۔

آپ کا مخلص
دستخط
ذوالفقار علی بھٹو

مفتی صاحب کو مسٹر بھٹو کا یہ خط ۱۴؍ مارچ کی رات دو بجے ملا۔ آپ نے اسی وقت جواب میں لکھا:

پشاور
۱۴؍ مارچ ۱۹۷۷ء

میرے پیارے بھٹو صاحب!

آپ کے خط محررہ ۱۳؍ مارچ ۱۹۷۷ء کے جواب میں، جو مجھے ۱۴؍ مارچ ۱۹۷۷ء کو دو بجے شب ملا، تحریر ہے کہ پاکستان قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہوں کے اجلاس میں آپ کی تقریر پر غور کیا گیا جو آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کی تھی۔ غور کرتے وقت ہمارے ذہن میں قوم کا وسیع تر مفاد تھا۔ اجلاس میں شرائط واضح نہ ہونے کے باعث بات چیت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔

اگر آپ کوئی نئی تجویز پیش کریں گے تو ہم اپنے اگلے اجلاس میں اس پر بخوشی غور کریں گے۔

آپ کا مخلص
دستخط
مفتی محمود
صدر پاکستان قومی اتحاد[1]

---

[1] ہفت روزہ "چٹان" لاہور ۴؍ اپریل ۱۹۷۷ء ص ۲۷

اس کے بعد چند مزید خطوط کا تبادلہ ہوا۔ مسٹر بھٹو چونکہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں دھاندلی کے موضوع پر کسی قسم کی گفتگو کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لیے اس خط کتابت کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا، اور ۲۴ر مارچ ۱۹۷۷ء کو مفتی صاحب کے ایک طویل خط کے ساتھ ہی یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا یہ خطوط اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

سہالہ میں

جب مفتی صاحب کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کیا گیا تو تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ فوج نے مختلف شہروں میں جو کچھ مشاہدہ کیا۔ وہ اپنی ہائی کمان کو بتا دیا۔ بری فوج کے چیف آف دی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے (بقول اُن کے) جون کے آغاز میں مسٹر بھٹو پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس بحران کو سیاسی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کریں۔ اندرونِ ملک جو کچھ ہو رہا تھا بی بی سی، وائس آف امریکا، ریڈیو جرمنی اور غیر ملکی اخبارات اور ایجنسیاں یہ سب کچھ اُچھال رہی تھیں۔ حالات بتدریج بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ جس پر پاکستان کے ہر بہی خواہ کی تشویش فطری تھی۔ اس دوران مسٹر بھٹو نے مفتی صاحب سے چھ بار سہالہ ریسٹ ہاؤس میں ملاقات کی، مگر اپنی بات پر قائم رہے جس پر مفتی صاحب نے سہالہ سے مسٹر بھٹو کو ایک خط لکھا۔ جس میں انہوں نے مسٹر بھٹو کو عقل کے ناخن لینے کی اپیل کی۔ اور بتایا کہ اب تو آپ کے چیف الیکشن کمشنر نے بھی انتخابات میں خوفناک بے ضابطگیوں کا اعتراف کرتے ہوئے تمام الیکشن کو مشکوک ٹھہرایا ہے۔ آپ قوم کے آگے سر جھکا دیں۔ اور موجودہ ناجائز اسمبلی توڑ کر دوبارہ الیکشن کرائیں۔ یہی ایک راستہ ملک کو درپیش

بحران کو حل کر سکتا ہے۔ اگر اس کے بغیر آپ مجھے ملنے آئے تو اب میں آپ کا خیر مقدم نہیں کروں گا۔ مسٹر بھٹو یہ خط ملنے پر بہت جزبز ہوئے۔ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اس خط کا حوالہ دیا۔ اور مکمل متن پڑھکر نہایت درشت لہجے میں اس پر تنقید کی۔ انہوں نے کہا "میں اپنی ذات اسمبلی پر قربان کر سکتا ہوں۔ اسمبلی کو کسی صورت نہیں توڑ سکتا۔" ساتھ ہی ریفرنڈم کی تجویز پیش کی، کہ اب ریفرنڈم ہی فیصلہ کرے گا۔ مسٹر بھٹو نے اپنی اس تقریر میں امریکا پر بھی سخت تنقید کی۔ اور نام نہاد "ڈالر سازش" کا انکشاف کیا۔ جمی کارٹر کی حکومت نے اس کا سخت بُرا منایا، وہ لوگ جنہیں پاکستان کی سالمیت اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اس صورتِ حال سے بے حد پریشان ہوئے۔ بالخصوص عرب ممالک نے بہت تشویش کا اظہار کیا۔ سعودی عرب، کویت اور لیبیا نے مسٹر بھٹو پر زور دیا کہ وہ اس مسئلہ کو سیاسی بنیادوں پر حل کریں۔

عربوں کی سعیِ مشکور

سعودی عرب کے سفیر متعینہ پاکستان شیخ ریاض الخطیب مسٹر بھٹو سے ملے اور شاہ خالد کی طرف سے پاکستان کو درپیش سیاسی بحران کے حل کے لئے اپنی خدمات کی پیش کش کی، تنظیم آزادئ فلسطین کے نمائندے مسٹر ہانی الحسن لیبیا کے وزیر خارجہ مسٹر طریقی بہ نفسِ نفیس پاکستان آئے۔ انہوں نے راولپنڈی میں مسٹر بھٹو سے اور سہالہ میں مولانا مفتی محمود اور پی این اے کے دوسرے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ پی این اے نے بتایا ہم مسٹر بھٹو کے ساتھ بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ بات چیت آخر کس موضوع پر ہوگی؟ کیونکہ وہ (بھٹو)، پچھلے الیکشن کو غیر منصفانہ مان کر دوبارہ الیکشن کرانے

کی بات ہی نہیں کرنے جبکہ فریقین میں اصل وجہ نزاع یہی ہے ۔ اس صورت میں ہم اُن سے کیا بات کر سکتے ہیں ؟ وہ کہتے ہیں اس موضوع پر کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی ۔ آپ انہیں آمادہ کریں ۔ وہ مذاکرات کے لئے اگر مثبت بنیاد فراہم کر دیں تو ہمیں باہم گفتگو پہ کیا اعتراض ہو سکتا ہے ؟ اس پہ یہ لوگ دوبارہ مسٹر بھٹو سے ملے ۔

مذاکرات، آغاز و انجام

مسٹر بھٹو پر جب ہر طرف سے دباؤ بڑھا تو وہ نئے الیکشن کی بنیاد پر پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں سے مذاکرات کرنے کے لئے تیار ہو گئے ۔ ۳ر جون کو مذاکرات کا آغاز ہوا مسٹر بھٹو کے مقابلے میں پاکستان قومی اتحاد کی سہ رُکنی مذاکراتی ٹیم کی قیادت کا شرف پی این اے کے سربراہ کی حیثیت سے مولانا مفتی محمود کو حاصل ہوا ۔ باقی دو ارکان نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب اور پروفیسر عبدالغفور احمد تھے ۔ یہ مذاکرات ۳ر جولائی تک جاری رہے ۔ کل تیرہ دور ہوئے ۔ جن میں ۴۴ گھنٹے ۳۳ منٹ بات چیت ہوئی ۔ ان مذاکرات کے دوران ایک نا تمام تصفیہ ۱۵ جون کو ہوا ۔ جسے مسٹر بھٹو بیچ راہ چھوڑ کر اپوزیشن سے مشورہ کئے بغیر غیر ملکی دورے پر چلے گئے ۔ اُن کی واپسی پر پھر مذاکرات شروع ہوئے ۔ ۲۹ر جون کو پاکستان قومی اتحاد نے اپنا آخری مسودہ سمجھوتے کے لئے پیش کیا ، ۳۰ر جون کو مفتی صاحب نے اعلان کیا " پاکستان قومی اتحاد نے حکومت کو اب جو مسوّدہ پیش کیا ہے وہ آخری ہے اور اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جائے گا ۔" انہوں نے واضح کیا ۔ " جہاں تک معاہدے پر عمل در آمد کرانے والی کونسل کا تعلق ہے حکومت کو انتخابات اور معاہدے پر عمل در آمد کرانے کے سلسلے میں کونسل کو مکمل اختیارات دینا پڑیں گے، ورنہ کونسل کا وجود ہی بے کار ہو کر رہ جائے گا ۔" انہوں نے حالات کی نزاکت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "معاملہ واضح ہے۔ جیسا کہ مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ اگر یہ بحران حل نہیں ہوتا تو کوئی راسپوتین، فرشتہ یا زارِ روس آجائے گا۔"

انہوں نے کہا "اگر مسٹر بھٹو کو اس بات کا یقین ہے تو وہ ہمارا مسودہ قبول کیوں نہیں کرتے؟ اگر وہ یہ مسودہ منظور کرلیں تو مصالحت ہوجائے گی۔ اور پھر نہ کوئی راسپوتین آئے گا، نہ فرشتہ اور نہ ہی زارِ روس۔ اگر وہ اب بھی ہمارے مسودے کو قبول نہیں کرتے تو پھر ایک بات واضح ہے کہ راسپوتین کو آپ خود دعوت دے رہے ہیں اور بحران کو حل کرنے کے سلسلے میں مخلص نہیں"[۱]

یکم جولائی کو جمعہ کے روز جو مذاکرات شروع ہوئے وہ دن کے علاوہ ۲ر جولائی کی تمام رات جاری رہے، یہ رات قیامت کی رات تھی، مسٹر بھٹو نے قومی اتحاد کے مسودے میں کچھ ترامیم تجویز کیں، پاکستان قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے اس کی منظوری کو پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی کمیٹی کی توثیق سے مشروط کیا۔ قومی اتحاد کی مرکزی کمیٹی نے اس نئے مسودے میں مندرجہ نکات کے بارے میں چند تصریحات طلب کیں اور "عملدرآمد کونسل" کے آئینی تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔ تاکہ اگر کسی مسئلہ پر کوئی اختلاف پیدا ہوجائے اور معاملہ سپریم کورٹ تک پہنچے تو وہاں اس سمجھوتے کی قانونی حیثیت کو چیلنج نہ کیا جاسکے۔ چنانچہ ۳ر جولائی کو دس بجے شب مولانا مفتی محمود اپنے رفقاء سمیت مسٹر بھٹو سے پھر ملے مسٹر بھٹو نے کہا۔ "میں اپنی کابینہ سے مشورہ کرکے آپ کو جواب دوں گا" وہ دراصل اس سمجھوتے کو آئینی تحفظ مہیا نہ کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ کسی آئینی تحفظ کے بغیر اس سمجھوتے کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہی چیز سمجھوتے میں سدِ راہ بن رہی تھی۔ در حقیقت مسٹر بھٹو کے عزائم ہی کچھ اور تھے۔ وہ توحیلوں بہانوں سے وقت

---

[۱] روز "نوائے وقت" لاہور یکم جولائی ۱۹۷۷ء

گذار رہے تھے۔ مذاکرات کے دوران میں اُن کا جو طرزِ عمل رہا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھوتے کے معاملہ میں کبھی مخلص نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کابینہ کے اجلاس کے بعد مسٹر بھٹو نے مفتی صاحب اور اُن کے رفقاء کو کوئی جواب دینے کی بجائے ایک ہنگامی پریس کانفرنس طلب کر لی اور پاکستان قومی اتحاد کو ہدفِ تنقید بنایا، انہوں نے ایسا تاثر دیا کہ گویا قومی اتحاد کچھ نئے نکات پیش کر کے کسی طے شدہ معاہدے سے منحرف ہو رہا ہے۔[1] اتحاد کی طرف سے نوابزادہ نصر اللہ خاں نے اسی روز (۴ جولائی کی شام کو) جوابی پریس کانفرنس بلائی۔ انہوں نے واضح کیا کہ "وزیر اعظم بھٹو نے عوام کو غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ قومی اتحاد نے نئے نکات پیش نہیں کیے۔ اور نہ کسی طے شدہ معاملے کو از سر نو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے" انہوں نے کہا:

"میں اس امر کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طویل نشست میں اگرچہ بہت سے امور زیر بحث آئے۔ تاہم کئی معاملات ایسے تھے جن پر ابھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نشست میں طے کیا گیا کہ مسٹر حفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور احمد پر مشتمل سب کمیٹی ان امور پر مزید غور کرے گی۔ اس طرح یہ کہنا کہ تمام امور طے پا چکے ہیں، حقیقت کے مطابق نہیں"۔ انہوں نے مزید کہا کہ "قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود نے اس روز پریس کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ ابھی کونسل کی توثیق ہونا باقی ہے۔ اس کے بعد ہی اس مسودے پر دستخط کیے جا سکتے ہیں"[2]

انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم مسٹر بھٹو کے اعلان اور وعدے کے مطابق اُن کی طرف سے کسی رابطہ کا انتظار کر رہے ہیں ــــــ لیکن مسٹر بھٹو نے شام تک

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء

[2] ایضاً

اتحاد کی مذاکراتی ٹیم سے کوئی رابطہ قائم نہ کیا، رات گئے فوج حرکت میں آگئی ۔ مفتی صاحب مدرسہ عربیہ کشمیر روڈ (راولپنڈی) میں ٹھہرے ہوئے تھے رات دو بجکر دس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی ۔ فون اٹھانے والے کو بتایا گیا "جناب! حضرت مفتی صاحب کو بتا دیجئے ۔ پروفیسر غفور صاحب کو فوج لے گئی ہے" یہ پروفیسر صاحب کے میزبان کا فون تھا ۔ مفتی صاحب نے یہ سُنا تو اپنے میزبان سے کہا "قاری صاحب! مسجد کا دروازہ کھلوا دیجئے ۔ آنے والوں کو خواہ مخواہ زحمت نہ ہو ۔ میں انتظار کرتا ہوں ۔ ساتھی چلے گئے ہیں، مجھے بھی جانا ہے" کچھ دیر بعد آنے والے آگئے ۔ مفتی صاحب کے دروازے پر دستک ہوئی ۔ مفتی صاحب کے سیکرٹری نے اُنہیں بتایا "حضرت وہ آگئے ہیں" ۔ مفتی صاحب باہر نکلے ۔ مُسکرا کر کہا ۔ "مَیں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا، آپ آگئے" ۔ اور پھر بغیر تفصیلات پُوچھے اُن کے ساتھ چل دیئے ۔

مفتی صاحب کا رخشِ زندگی اپنی رَو میں سَرپٹ دوڑا جا رہا ہے ۔ کہیں تھمے تو مزید کچھ لکھنا ممکن ہو ۔ لہٰذا

ع ۔ قلم ایں جا رسید و سر بشکست

بیسواں باب

افکار و خیالات

اس باب میں دو چیزیں شامل ہیں !

اولاً مفتی صاحب کا ایک انٹرویو، جو انہوں نے ۷۰ء کے الیکشن کے دوران کراچی کے ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" کو دیا ـــــ مفتی صاحب کی شخصیت وسیاست اور افکار و خیالات پر اتنی خوبصورت تحریر آج تک کوئی اور نہیں چھپی۔

ثانیاً اُسی الیکشن کے موقع پر ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہونے والی انتخابی تقریر جس کے بارے میں بلاشبہ کہا جاسکتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ،
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان دونوں سے آپ کو مفتی صاحب کے ذہنی و فکری رجحانات کا کماحقہٗ اندازہ ہوگا۔

یادگار انٹرویو

سر پر ایک بڑا سلکی رومال، عمامے کا منصب ادا کرتا ہوا، گھنی داڑھی قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتی ہوئی، آنکھوں میں تدبّر کی گہرائیاں، چہرے پر گزرے ماہ و سال کے نقوش، کھلا کرتا اور شلوار جسے دیکھ کر کراچی میں پنجاب یاد آجاتے۔ آواز میں سنجیدگی اور متانت کا آہنگ، نیچے ایک دری پر آلتی پالتی مارے، گاؤ تکیے کا سہارا لیے مولانا مفتی محمود صاحب کو معتقدین کے سامنے سیاست و مذہب کے اسرار و رموز کھولتے ہوئے دیکھا تو مجھے پہلے کوئی ایسا سیاسی رہنما یاد نہ پڑا جسے اس درویشی کی حالت میں ایک مسجد کے حجرے میں دیکھا ہو، البتّہ میرے ذہن کے گوشوں میں تاریخ کے بعض اوراق انگڑائیاں لے کر اٹھے اور میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔ جب مذہب و سیاست یک جا تھے اور مسجد سیاست کا بھی مرکز تھی۔ صرف عبادت گاہ ہی نہیں تھی۔ مجھے ایسے دردمندوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو مذہب اور سیاست کی یک جائی کے قائل ہیں۔ اسلام پر مر مٹنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار بنتے ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات یا تو ایئر کنڈیشنڈ ہوٹلوں کے کمروں میں ہوتی یا آراستہ پیراستہ بنگلوں میں۔ مسجد میں وہ کبھی نظر نہ آتے۔ مسجد کے حجرے میں ملاقات ویسے ہے بھی خاصی مشکل۔ جوتے باہر اتارو، مؤدب ہو کر بیٹھو۔ چائے پانی کوئی چیز ہو دائیں ہاتھ سے پیو۔ مسجد کا ماحول ہی ایسا ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی آزاد خیال ہو، وہاں وہ پکا مسلمان ہو جاتا ہے۔

جمعیت علماء اسلام کے ناظمِ اعلیٰ مولانا مفتی محمود سے ملنے کے لیے ہمیں نیوٹاؤن کی مسجد میں جانا پڑا۔ ان کے گرد معتقدین کا ہجوم تھا۔ کپڑے کی سفید ٹوپیوں، سفید کرتوں، سفید شلواروں اور سیاہ داڑھیوں والے یہ لوگ صرف نماز روزے والے مولوی نہیں تھے، بلکہ انہیں سیاست ملکی اور بین الاقوامی دونوں سے خاصی واقفیت تھی۔ اس گفتگو میں اسلام، سوشلزم کے تذکرے بھی تھے۔ امریکہ، روس کی سیاسی شعبدہ بازیوں کے قصے بھی عربوں اور اسرائیل کی آویزش کا پسِ منظر بھی۔

مفتی صاحب آج سے پچاس برس پہلے ۱۹۱۹ء میں پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ ہی ہوئی۔ پھر ہائی سکول تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم کے لیے چلے گئے۔ یہ کوئی ۱۳۵۵ھ اور ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ دیوبند میں ایسے اساتذہ سے تعلیم پائی تھی جو اس وقت میدانِ سیاست کے شہسوار تھے اور انگریز دشمنی ان کے ایمان میں شامل تھی۔ اس لیے مفتی صاحب نے بھی فارغ التحصیل ہو کر اپنے علاقے میں انہی خطوط پر کام شروع کر دیا۔ بعد میں وہ جمعیۃ علماء ہند کی مرکزی کونسل کے ممبر بن گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی دعوت پر جمعیۃ علماء اسلام میں شرکت کی۔ اس وقت سے اب تک اسی سے وابستہ ہیں۔ ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ اس وقت وہ مدرسہ قاسم العلوم کے شیخ الحدیث اور مفتی ہیں۔

محمود شام

اِسلامی نِظام

"پاکستان کا سب سے بنیادی مسئلہ پاکستان میں اُس نظام کو قائم کرنا ہے جس کے لیے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔" مفتی صاحب میرے پہلے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ ان کی آواز میں اعتماد اور تیقّن تھا۔ معتقدین ہمہ تن گوش تھے۔ میں گردن جھکائے ان کے خیالات قلم بند کرنے میں محو تھا۔ کنکھیوں سے دیکھا نور ریاض کیمرے کو سنبھالے نشانہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی، ارد گرد ایسے لوگ تھے جن سے کسی بھی لمحے خطرہ تھا کہ وہ اس گستاخی پر کیمرہ ہی نہ چھین لیں،

میرا قلم پہلے فقرے سے پیوستہ یہ جملہ لکھ رہا تھا: "اس لئے کہ پاکستان کا وجود پاکستان کی سلامتی اور استحکام اسلامی نظام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کہا یہ گیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان میں اسلامی محاکم قائم ہوں گے اور پاکستان کا معاشرہ اسلام کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔ یہاں کے مسلمان باشندوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے تمام مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے اندر سیاسی قوّت ۲۲ سال تک ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ جنہوں نے آج تک مسلمانوں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک اسلامی ملک کے آزاد شہری ہیں۔ مسلمان سب سے زیادہ اپنے مذہب سے پیار کرتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کے لوگوں کے مزاج کے خلاف اگر کوئی نظام وہاں قائم ہوگا۔ تو وہ اُس ملک کے ضعف و کمزوری کا سبب ہوگا۔ اس لئے پاکستان میں استحکام کے لئے ضروری ہے کہ یہاں سب سے پہلے اسلامی نظام کو قائم کرنے کی حقیقی معنوں میں کوشش کی جائے۔"

مفتی صاحب نے ذرا سا سانس لینے کی کوشش کی تو میں نے فوراً یہ سوال کر دیا

"لیکن اسلامی نظام نافذ کیسے کیا جائے"

کہنے لگے: "یہ واقعی خاصا مشکل سوال ہے کہ (اس ملک میں) اسلامی نظام کیسے نافذ کیا جائے۔ اسلامی نظام کے قیام کے لئے سب سے مقدم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی اور ملّی شعور بیدار کر کے انہیں پوری آزادی کے ساتھ اپنے نمائندے منتخب کرنے کا احساس دلایا جائے اور پھر ملک میں ہر قسم کے دباؤ اور اثرات سے آزاد انتخابات کا باقاعدہ انتظام ہو تاکہ پاکستان کا ہر مسلمان شہری لالچ، غرض اور کسی خارجی اثر سے بے نیاز ہو کر نیک و بد نمائندے کی تمیز کرتے ہوئے اپنے نمائندے منتخب کرے۔ وہ لوگ جن کی اپنی زندگیاں اسلام کے منافی ہوتی ہیں۔ وہ اسلامی منشور لے کر مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم اسلام کے نظام کو قائم کریں گے، ان لوگوں سے مایوس ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ جو حضرات اپنے چھوٹے سے ملک (یعنی سر سے پاؤں تک جو کہ قریباً ۶ فٹ طویل ہے) میں اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے، اور جو اپنے گھر پر مشتمل صرف چند مرلوں کے ملک میں اسلام کے نظام کو نافذ نہیں کر سکتے، حالانکہ وہاں ان کی مرضی چلتی ہے۔ وہ اتنے بڑے وسیع و عریض پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے روادار کیسے ہو سکتے ہیں۔

طرزِ حکومت

ہمارا دوسرا سوال تھا "پاکستان کے لئے کون سا نظامِ حکومت بہتر ہے"۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی نظام کا قیام برحق مگر ہمیں آج کے دور کی اصطلاحات پارلیمانی نظام اور صدارتی نظام کے مطابق بتائیے، نظامِ حکومت کی کیا شکل ہو گی؟

مفتی صاحب نے فرمایا: "اصل بات سربراہِ حکومت کی اہلیت ہے۔ اسلام اس میں خود کوئی اصول وضع نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے

ماحول کے مطابق بہتر صورت خود تجویز کریں۔ ایک دلچسپ بات میں آپکو بتاؤں کہ اسلام میں کسی سربراہ کو معزول کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن سربراہ کے انتخاب کی بہت کڑی شرطیں ہیں کہ وہ علمی، عملی، دینی اور فکری اعتبار سے بہتر ہو۔ ان سب اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر سربراہ منتخب کیا جائے تو اسے معزول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے سربراہ اگر اب تک یعنی چودہ سو سال زندہ رہتے تو انہیں کون معزول کرتا۔ لیکن ایوب خاں جیسے آمر کو تو پہلے دن منتخب کرنا ہی غلطی ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں موجودہ حالات کے تحت ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ کسی ایسے شخص میں بہت سے اختیارات اکٹھے کرلئے جائیں جو اسطرح ملک کے لئے مفید ہوسکے۔ ہمارے سامنے ایوب خاں کی دس سالہ آمریت کی مثال ہے، اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ ان حالات کے تحت وہی نظام بہتر ہوگا۔ جس میں سربراہ کے اختیارات تھوڑے ہوں اور زیادہ اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہوں۔"

محدود جمہوریت

مفتی صاحب نے اپنے اس مؤقف کی مزید وضاحت فرمائی "ہم محدود جمہوریت کے قائل ہیں جو علی الاطلاق جمہوریت ہے۔ حاکمیت عوام اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حاکمیت کا حق صرف اللہ رب العزت کو حاصل ہے۔ البتہ عوام کے نمائندوں کا وہ فیصلہ صحیح اور جائز ہوگا جہاں پر اللہ نے ان کو ان معاملات میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہوگا۔ لیکن جہاں عوامی نمائندوں کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلوں سے متصادم ہو۔ وہاں عوامی نمائندوں

کا فیصلہ حقیقت نہیں رکھے گا۔

اس مرحلہ پر مَیں نے عرض کیا کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ عوامی نمائندوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے متصادم ہے؟

"اس کے لئے کسی کورٹ سے فیصلہ لیا جائے گا"۔ مفتی صاحب نے برملا جواب دیا: "اور یہ وہ کورٹ ہے جو اسلامی نظام کے تحت قائم کی گئی ہو۔ ایک ایسا بورڈ بھی ہونا چاہیئے جو کہ ملک کے جید علماء فقیہ النفس فضلا پر مشتمل ہو۔ اور جسے اسلام کی تعبیر کے بارے میں آخری اختیارات حاصل ہوں۔"

یک جہتی

اب ہم تیسرے سوال پر پہنچ چکے تھے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں یکجہتی پیدا کرنے اور دونوں بازوؤں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کے لئے سب سے مؤثر اقدام کیا ہو سکتا ہے؟

"میرے خیال میں" مفتی صاحب کہنے لگے: "اسلامی اخوت کے جذبات کو اجاگر کرنا ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں حصوں کے مسلمانوں کو اکٹھا رکھنے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہو سکتا ہے اور یہ کہ دونوں صوبوں کے لوگوں کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ برتا جائے۔ نیز یہ کہ اقتصادی عدمِ مساوات کو دُور کرنے کے لئے کوئی مؤثر قدم اٹھایا جائے۔ زبان کے اختلافات کی وجہ سے جو بُعد دونوں حصوں میں رہا ہے اس کو اس طرح کم کیا جا سکتا ہے کہ عربی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ پانچ برس کے عرصے میں پاکستان کے لوگ بخوبی عربی زبان بول سکیں گے اور لکھ سکیں گے۔ عربی زبان سے مسلمانوں کو دلی لگاؤ ہے۔ یہ کلام اللہ کی زبان ہے۔ اسکے

ساتھ سب مسلمانوں کو عقیدت ہے۔ اس لئے لوگ اس طرف بہت جلد مائل ہوں گے۔"

خارجہ پالیسی

میں نے عرض کیا "خارجہ پالیسی کن خطوط پر پاکستان کے حق میں بہتر رہ سکتی ہے"۔ جواب تھا۔ "آزاد اور غیر جانب دار پالیسی ہی پاکستان کے حق میں بہتر ہو سکتی ہے۔ پاکستان کو اپنے مفاد کے پیش نظر اور اسلام کے اصولوں کی روشنی میں ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ جس سے پاکستان اسلامی ملکوں کی قیادت کی اہلیت بھی اپنے اندر پیدا کرے، اور بین الاقوامی دنیا میں بھی اسے مستحکم پوزیشن حاصل ہو۔ بلا وجہ دوسروں کی جنگ میں کسی ایک کا آلہ کار بن کر دوسروں سے مخاصمت کرنا ملک کے لئے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ پاکستان کو مغربی ممالک کے ساتھ کئے ہوئے تمام فوجی معاہدوں سے فوراً دستبردار ہو جانا چاہیئے اور عرب ممالک کو یقین دلانا چاہیئے کہ پاکستان ان کے بھائی کی حیثیت سے ہر وقت ان کے ساتھ ہے۔ اسی طرح پاکستان کو اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ بھی اچھے روابط قائم کرنے چاہئیں۔ تاکہ خارجی خطرات سے محفوظ رہ کر پاکستان اندرونی ترقی کے لئے آزادی کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔"

اِسلامی ممالک کا اِتحاد

میں نے اس ضمن میں اُن سے اسلامی ملکوں کے درمیان ایک فوجی معاہدے کے امکان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "اسلامی ملکوں کا بلاک ضرور بننا چاہیے لیکن یہ نہیں کہ یہ امریکہ وغیرہ کا آلۂ کار بن جائے۔ آج کل اس سلسلے میں جو نعرے لگ رہے ہیں ان میں سے بیشتر اسی قسم کے بلاک کے لئے

ہیں۔ لیکن اگر مسلمان ممالک مغربی سامراج کو شکست دینے کے لئے امریکی استحصالی طاقت کو مسلم ممالک سے مار بھگانے کے لئے متحد ہو جائیں۔ اسی طرح اشتراکیت کے اثرات سے تمام مسلمان ممالک کو محفوظ رکھنے کے لئے اسلامی ممالک کا اتحاد ہو تو یہ یقیناً ایک نیک فال ہو۔"

اقتصادی پریشانی کا حل

اب مسئلہ تھا عوام کی اقتصادی الجھنوں کا۔ ہمارا استفسار تھا کہ عوام کی اقتصادی پریشانی کا فوری اور واقعی حل چند خاندانوں میں سمٹی ہوئی دولت پورے ملک کے عوام کی خوش حالی کا ذریعہ کیسے بن سکتی ہے؟ وہ جواب دینے لگے "اس میں کوئی شک نہیں۔ اس وقت ملک میں سب سے اہم ملک کی ۹۰ فیصد آبادی یعنی غریب آبادی کے طبقے کے مسائل ہیں جو ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں جنہیں اپنے وطن میں نہ مکان نہ خوراک نہ لباس اور نہ زندگی کی ضرورتیں مہیا ہیں اور وہ یقیناً حیوانات سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ جب تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اس وقت تک پاکستان میں کسی کو امن و سکون حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک عام مسلمان تو پاکستان میں محنت کرنے کے باوجود اپنے بچوں کا پیٹ نہ پال سکے اور بھوک اور فاقے کی زندگی گزارتا رہے جب کہ چند انسان یہاں پر خرمستیاں کرتے پھریں۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

مات الکلب جوعٍ علی شطِ الفرات لکان عمر مسئولاً عن یوم القیٰمۃ۔

"اگر ایک کتا دریائے فرات کے کنارے بھوک سے مر جاتا ہے تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کا بھی سوال کیا جائے گا۔" اسلام کی تو یہ روح ہے۔

جہاں تک سوال کے دوسرے جزو کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں عرض کرونگا۔

کہ اس کے لئے بنیادی طور پر زمینداریوں اور کارخانوں کے مسائل کا حل کرنا ضروری ہے، اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا شرعاً اس کا مالک ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق تمام وہ زمینیں جو عنقریب آباد ہوئی ہیں موجودہ آباد کار مزارعین ان زمینوں کے مالک قرار دیئے جائیں اور قدیم آباد زمینوں سے متعلق یہ تحقیقات کی جائے کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں۔ یا انگریز نے بطور جاگیر کے حق الخدمت میں کسی کو عطا کی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایسی اراضی کو لازماً واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر مزارعین کی مظلومیت اس کے باوجود محسوس ہو تو کوئی بھی اسلامی حکومت ضرورت و معاملت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ تینوں امام اس پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں ہے۔ چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اور ائمہ میں اختلاف رہا ہے۔ اس لئے ضرورت کے تحت اس کو ممنوع قرار دینا کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا بڑے بڑے صنعت کاروں کے متعلق سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ حکومت لازمی طور مزدوروں کی تنخواہوں کو اس حد تک بڑھا دے کہ مزدور کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے۔ جس سے ان کی گھریلو ضروریات، بچوں کی تعلیم اور علاج وغیرہ کی حسن و خوبی کے ساتھ کفالت ہو سکے، اس طرح یہ مسئلہ آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ امر مسلّم ہے کہ جو لوگ دس کروڑ پاکستانی بھوکے عوام کے مسائل کو حل کئے بغیر یہ سمجھتے ہیں کہ چند سرمایہ داروں سے پاکستان میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ وہ جنت الحمقاء میں بستے ہیں۔ غریبوں کے مسائل حل کئے بغیر نہ پاکستان ترقی کر سکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

زرعی پالیسی

مفتی صاحب شائد کچھ تھکن محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے تکیہ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ پھر اگلے سوال کے لئے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اپنا چھٹا سوال پوچھ رہا تھا۔ ”بنیادی طور پر زرعی ملک پاکستان میں زراعت کو ملکی خوش حالی کا سرچشمہ بنانے اور ترقی یافتہ زرعی ملک کے برابر لے جانے لئے کیا قدم اٹھایا جانا چاہیئے۔“

مفتی محمود کی اعتماد سے بھرپور آواز آئی۔ ”زراعت کو عام کیا جائے، غیر آباد علاقوں کو آباد کیا جائے۔ زمینوں کو ناجائز طور پر سیاسی رشوتوں کیلئے الاٹ نہ کیا جائے۔ زمینیں بے زمین لوگوں میں الاٹ ہوں، آبپاشی کے ذرائع کی توسیع ہو، مشینی آلات کے ذریعے سے بھی ملکی زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے بشرطیکہ مشینی آلات کے تمام ذرائع اجتماعی طور پر استعمال ہوں۔ ایک شخص کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں۔ اس طرح مزدور اور کسان بے کار ہو جائیں گے۔“

معکوس ترقی کا حل

میرے سوال کی نسبت جواب مختصر تھا۔ میں نے بھی ضمنی سوال پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ عصر کا وقت قریب تھا۔ مجھے انٹرویو نامکمل رہ جانے کا ڈر تھا۔ اس لئے فوراً میں نے ساتواں سوال کر ڈالا۔ ”صرف بڑے بڑے شہروں میں صنعتی تنصیبات نے کیا چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات کو اقتصادی پسماندگی کا شکار نہیں کر دیا؟ اور معکوس ترقی کو جنم نہیں دیا۔“ ؟

مفتی صاحب شائد اس سلسلے میں پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ فوراً بول اٹھے۔ ”بڑے شہروں میں کارخانوں کے قیام نے دیہات کی ترقی کیا وجود ہی کو ختم کر دیا

ہے۔ غریب لوگ دیہات سے بھاگ رہے ہیں۔ شہروں میں کارخانوں میں ملازمت کرتے ہیں۔ شہروں کے مسائل بھی اس طرح بڑھ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ دیہی ترقیاتی اسکیم پر زور دیا جائے اس لئے کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس کے بغیر ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا اور اس روش سے ملک کی زرعی معیشت بھی بہت متاثر ہوتی ہے۔

بیوروکریسی

اب یادش بخیر ذکر چھڑ گیا۔ بیوروکریسی کا مفتی صاحب نے فرمایا "اس ملک کا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو برا حال ہو رہا ہے وہ بیوروکریسی اور نوکر شاہی کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس کا واحد حل عوام کی حکومت کا قیام ہے۔ عوامی حکومت جب حقیقی معنوں میں کسی ملک میں قائم ہوتی ہے تو اس میں نوکر شاہی خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے یوم تاسیس سے لے کر آج تک ایک مرتبہ بھی ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کوئی عوامی حکومت قائم نہیں ہو سکی ہے اور شائد اس میں بھی بیوروکریسی کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس لئے جتنی جلدی ممکن ہو عوامی حکومت قائم کی جائے تا کہ چند غلط کار افسروں کے مظالم سے قوم کو نجات مل سکے"

تعلیم

انٹرویو کے دو سوال باقی رہ گئے تھے اور مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہو رہی تھی: "اللہ سب سے بڑا ہے"۔ اب میں نے انٹرویو کو سمیٹنے کی کوشش کو اور تیز کر دیا۔ سوال تھا۔ کیا تعلیم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ضروری ہے، ضروری ہے تو اس کے لئے کیا اقدام اٹھائے جائیں؟"

ملک میں تعلیم یقیناً ملک کی ضروریات کو پورا نہیں کرتی ہے، مفتی صاحب کا مشاہدہ یہ تھا اور مشورہ یہ تھا۔ "چاہیئے تھا کہ آج ملک کا ہر شہری تعلیم کی زینت سے آراستہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ملک کی غالب اکثریت اَن پڑھوں کی ہے، ۲۲ سال کی حکومتوں نے تو اس ملک کے انگریزوں کے مقرر کردہ نصاب تعلیم کو بدلا، نہ نظامِ تعلیم میں کوئی خاص تبدیلی نظر آئی۔ انگریز نے اپنے قومی مفادات کے پیش نظر جس طرح کی تعلیم دے کر یہاں کے لوگوں کی غلامانہ ذہنیت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اب بھی اسی طرح کی تعلیم ملک میں جاری ہے۔ سب سے مقدّم ہے کہ موجودہ نصابِ تعلیم کو بنیادی طور پر بدلا جائے۔ نصابِ تعلیم اس طرح کا ہو کہ اسے پڑھ لینے کے بعد اس کا فارغ التحصیل فاضل دینی اور دنیاوی اعتبار سے کامل انسان کہلانے کا مستحق ہو۔ تعلیم کے نصاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس کا اثر طالب علم کے عقیدے پر، اس کے خیالات پر، نظریات پر اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق پڑتا جائے اور ہر طرح کے ملحدانہ غیر اسلامی افکار اور نظریات سے قوم کے نونہالوں کے ذہنوں کو محفوظ رکھا جائے۔ نیز نصابِ تعلیم اس طرح کا ہو جس سے ایک طالب علم یہ محسوس کرے کہ میں ایک آزاد ملک کا باعزّت شہری ہوں اور اس کے ذہن میں برتری کا احساس ہو وہ کسی غیر ملکی قوم سے اپنی قوم کو کمتر خیال نہ کرے۔"

جماعت تیار ہونے کی خبریں مل رہی تھیں اور میں آخری سوال پوچھ رہا تھا "طلباء اور نوجوانوں میں پھیلے اضطراب کا کیا حل ہے؟

مفتی صاحب فرمانے لگے۔ "ان کی تعلیم مفت ہو۔ کسی بھی مرحلے پر کوئی قیمت وصول نہ کی جائے۔ اس سے اقتصادی طور پر طلباء مطمئن ہوں گے۔ ادھر ان طلباءَ کے ذہنوں کو اسلامی تعلیم کے مطابق مطمئن کر دیا جائے تو اضطراب کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ فکری اعتبار سے اطمینان اس طور پر ہو سکتا ہے کہ انہیں بہترین اخلاق کی تعلیم دی جائے۔"

طلباء اور سیاسی جماعتیں

"میں نے جاتے جاتے ایک اور سوال پوچھ لیا کہ بعض سیاسی جماعتیں طلباء کو استعمال کرتی ہیں۔ اس لئے بھی ہنگامے جنم لیتے ہیں۔"

"طلباء ان سیاسی جماعتوں کا آلہ کار ہو کر اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو جماعتیں دوسرے ملکوں کے مفادات کے لئے کام کرتی ہیں۔ ان سے طلباء کو خبردار رہنا چاہیئے۔ اگر طالب علموں کے سامنے ملکی استحکام، امن، سلامتی اور ملک کے لوگوں کے درمیان صلح و آشتی جیسے اہم امور ہوں گے تو پھر یہ خود بخود ہی غیر ملکی ایجنٹوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔"

سوالات ختم ہو چکے تھے اور جماعت بھی تیار تھی۔ سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک گئے تھے۔

---

[1] ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی کو مولانا مفتی محمود کا انٹرویو ٢۴ ستمبر ١٩٦٩ء ص ٨

نشری تقریر ○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ○
اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ
وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ط

برادرانِ ملّت! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے کارپردازان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے فضا کی ریڈیائی لہروں کے ذریعہ مجھے آپ سے براہِ راست مخاطبت کا موقع مہیّا کیا اور آپ تک کلمۂ حق پہنچانے کا وسیع ترین ذریعہ بہم پہنچایا۔ میرے پاس وہی ایک پیغام ہے جسے سال ہا سال سے میں اور میرے دوسرے رفقاء کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ پیغام گذشتہ چودہ سو سال سے زمین و آسمان کی فضاؤں میں گونجتا چلا آرہا ہے اور سیدالمرسلین خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے اللہ تعالیٰ نے اس پیغام کو قیامت تک کے لیے عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود کے واسطے مقرّر فرمایا ہے یہ پیغام اللہ و رسول کا پسندیدہ دینِ اسلام ہے۔

جیساکہ میں نے شروع میں قرآنِ حکیم کی آیت تلاوت کی ہے کہ: اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ

○ یہ تقریر ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوئی۔

لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ اس آیت میں اللہ تعالٰی نے صاف صاف فرمایا ہے کہ میں نے آج کے دن تمہارے لیئے دین کی تکمیل کر دی ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے بطور دین کے میں نے اسلام کو پسندیدہ قرار دے دیا ہے۔

پس یہ ہی دینِ اسلام ہے جس کا قیام و نظام کُل پاکستان جمعیتہ علماء اسلام کا مقصود و مدعا ہے اور اس دین کو قائم و نافذ کرنے کے لیئے ابتدائی اقدامات کے طور پر کل پاکستان جمعیتہ علماء اسلام نے اسلامی منشور کی صورت میں ایک خاکہ پاکستان کے مسلمان عوام کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

برادرانِ محترم! شروع میں بیان کردہ آیتِ قرآن سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام کا نظام ایک کامل نظام ہے۔ اللہ تعالٰی کی اکمل فرمودہ نصیحت ہے اور اس کا پسندیدہ دین ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسلام کے مقابلے پر دنیا کا کوئی نظامِ حیات مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

دُنیا کی ماضی کی تاریخ بھی ہمارے سامنے ہے اور وقت کے موجودہ حالات بھی ہماری نظروں سے گذر رہے ہیں۔ ماضی کی تاریخ اور وقت کے حالات سب ہی شہادت دے رہے ہیں کہ ہدایتِ الٰہی سے رُوگرداں ہو کر انسانیت نے ہمیشہ نقصان ہی اُٹھایا اور وہ فساد و انتشار کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ۔ کہ انسان جب بھی راہِ حق سے ہٹا اُس کے ہاتھوں بحر و بر میں فساد برپا ہُوا چنانچہ خود انسانیت کی بھلائی کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالٰی کی زمین پر اللہ کا دین قائم ہو تاکہ بحر و بر کا یہ فساد ختم ہو جائے اس اعتبار سے یہ ذمہ داری مسلمانوں پر بالخصوص عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے اپنے درمیان اسلام قائم کریں۔ اور

اس کی برکات و خوبیوں کا مظہر بن کر دنیا بھر کو اسلام سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ اس لئے کل پاکستان جمعیتہ علماء اسلام چاہتی ہے کہ پاکستان میں اسلام کامل و مکمّل طریقہ پر نافذ کر دیا جائے تاکہ دنیا کے سامنے اسلام کی حقانیّت اور اس کی خیر و برکات کا عملی نمونہ آجائے۔

سامعین محترم! میں پوری بصیرت اور پورے یقین کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ عہدِ حاضر کے وہ تمام پیچیدہ مسائل جن سے انسانیّت کو سابقہ پڑا ہوا ہے ان کا بہترین حل اسلام میں موجود ہے اور پاکستان جن مسائل سے دوچار ہے وہ بھی صرف اسلام کو اختیار کرنے سے ہی حل ہو سکتے ہیں۔

کل پاکستان جمعیّتہ علماء اسلام اوّل دن سے اس بنیادی اور اہم نکتہ پر زور دیتی چلی آرہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور نے انسانی فکر کو ہی نہیں بلکہ اجتماعیّت کے ایک ایک مسئلہ کو ہمہ گیر طور پر متاثر کیا ہے آج انسان کو گہرے اعتماد و یقین کی ضرورت ہے اور اجتماعیّت کے مسائل میں انسانیّت کے مجموعی مفاد کا مقدّم رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام ان دونوں ضرورتوں کو جس خوبی و کمال کے ساتھ پورا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ قرآن و سنّت کے پُربصیرت مطالعہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

اسلام انسان کو ایک نہایت مستحکم اور غیر متزلزل عقیدہ و یقین سے سرشار کر دیتا ہے جس کے اثر سے ایک مومن و مسلم زندگی کی ہر مشکل عبور کرتا ہوا موت کے پل پر سے ہنستے مسکراتے گذر جاتا ہے اور انسانیّت کے مجموعی مفاد کو اسلام میں اس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کی بھلائی اور فائدے کے لئے اپنی محبوب سے محبوب چیز کو قربان کر دینے کا پابند ہے۔

ان صفات کے حامل دین سے ہی تمام مسائل کے حل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور پاکستان میں ہم مسلمان اس کا عملی مظاہرہ کر کے دنیا کو اس طرف متوجّہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان

میں بھی ہمارے مسائل کی یہی نوعیت ہے۔

ہمارے یہاں بھی بے یقینی اور بے دینی کے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ عوام میں غلط قسم کی سیاسی، اقتصادی و معاشی درجہ بندی ہے۔ اور ان باتوں کے نتیجہ میں ہر طرف بے چینی بے اطمینانی اور انتشار سر اُٹھاتے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم ان سب کا ازالہ نہیں کر لیتے۔ ایک بہتر مُستقبل کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہمیں پاکستان کی نئی نسل کو بے یقینی اور بے دینی کے خطرات سے بچانا ہے ہمیں سیاسی جبر و روایات کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمیں اقتصادی تفاوت کے ایسے جھول دُور کرنے ہیں جن سے بے چینی اور بے اطمینانی کے سائے گہرے ہونے جا رہے ہیں۔ ان دونوں مقاصد کو اسلامی احکام کے ذریعہ ہی بہتر طریقہ پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب ایک بار مُلک میں اللہ کی حاکمیّت کا اصُول نافذ ہو جاتا ہے۔ قرآن و سنّت کے تمام احکام اور ارشادات دستور و قانون کی اساس قرار پا جاتے ہیں۔ اور مُلک کے تمام انتظامی محکمے عدلیہ، پولیس اور فوج وغیرہ ان احکام کی پابند بنا دی جاتی ہیں تو اس کے بعد کسی بھی گروہ کے لئے سیاسی جبر و بالادستی کے مواقع باقی نہیں رہتے۔ اسلام کی رو سے سربراہِ مملکت سے لے کر ایک عام شہری تک اسلامی احکام کے اجراء و نفاذ کی پابندی سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا اور سب یکساں طور پر قانون کے سامنے جواب دِہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح تمام سیاسی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جمعیّتہ علماء اسلام اس قسم کی سیاسی تبدیلی اس ملک میں لانا چاہتی ہے اور اُس نے اپنے منشور میں اپنے اس سیاسی مؤقف کی واضح نشاندہی کر دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ایک بار مُلک کا اقتصادی و معاشی ڈھانچہ تمام حرام و ناجائز ذرائع سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ اور صرف حلال ذرائع پر اسے از سر نو منظم کر دیا جاتا ہے۔

اور ان تمام مراعات کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے جو غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے پسندیدہ افراد اور حلقوں کو دی تھیں تو اس کے بعد ایک ایسا معاشی و اقتصادی نظام وجود میں آسکتا ہے۔ جس میں جائز ملکیتیں بھی باقی رہیں گی۔ اور اقتصادی نظام مساوات کا بھی نفاذ ہو جائے گا۔ جمعیتہ علماء اسلام نے اپنے منشور کے اقتصادی حصہ میں ان امور کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

عزیزانِ ملت! میری جماعت کا سیاسی اور اقتصادی موقف صرف یہ ہی ہے اور ہم ایک ایسے نظامِ حیات کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں جو ہمیں عہدِ حاضر کی تمام غیر اسلامی باتوں سے نجات دے سکے اور رفتہ رفتہ خلافتِ راشدہ کے دور کے نظام کی جھلک پیدا کر دے۔ جس طرح عہدِ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز و تفاوت قائم نہیں تھا۔ حاکم و محکوم، راعی اور رعایا، خلیفہ اور عام مسلمان ایک ہی جیسی زندگی بسر کرتے تھے اور ایک دوسرے کے معاون اور بھائی بن گئے تھے۔ ٹھیک ٹھیک وہی صورتِ حال پھر مسلمانوں میں پیدا ہو جائے۔ جیسے قرآن حکیم میں اِن لفظوں کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔ یعنی اللہ تعالےٰ کی مہربانی سے سب بھائی بھائی بن گئے۔ اس لئے میری جماعت پاکستان کے غریب عوام، کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور تمام آدمیوں کو اُس سطح پہ لانا چاہتی ہے۔ جہاں پاکستان کے تمام مسلمان عملاً بھائی بھائی نظر آسکیں۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہو سکے گا۔ جب کہ لا محالہ طور پر ملک میں قرآن و سنت کے احکام نافذ کر دیئے جائیں۔ خاتم النبیین اور خلفائے راشدین کے عہد کا عملی نمونہ اختیار کر لیا جائے اور ملک سے سیاسی، اقتصادی اور معاشی ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔

حضرات! پاکستان کی سالمیت و استحکام کا بھی تقاضہ ہے کہ ملی وحدت

کے رشتوں کو مضبوط تر بنایا جائے۔ ملّی وحدت کے رشتے جب ہی پروان چڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہاں سیاسی اور اقتصادی امور میں اسلامی وحدت کے اصول کارفرما ہوں۔ ہر مسلمان سیاسی طور پر اپنے آپ کو آزاد اور معاشی طور پر خوشحال محسوس کرے اور سب کے سب عقیدہ و عمل کی ایک ہی ڈوری میں بندھے ہوئے ہوں۔ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا کا بھرپور مظاہرہ ملّت کے ہر گوشہ سے نمایاں ہو۔ برطانوی عہد کے سیاسی، سماجی، انتظامی، عدالتی اور اقتصادی امتیازات کو برقرار رکھ کر برائے نام تبدیلی سے انہیں اسلام کا نام دے کر ہم ہرگز ہرگز ملّی وحدت کے مقاصد اور اسلامی نظام کی برکتوں کو حاصل کرنے کے قابل نہیں بن سکتے۔

محترم برادرانِ ملّت! میری ان گذارشات سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، کہ میری جماعت کل پاکستان جمعیتہ علماء اسلام کا مقصود و منزل کیا ہے ہم اس ملک میں کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کا نظام حکمرانی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی رُو سے ملک کا ہر شعبہ بے دینی کے اثرات اور حرام و ناجائز باتوں کی شمولیت سے پاک ہو جائے۔ جس کی رُو سے ملک کے تمام مسلمان بھائیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل بن جائیں۔ جس کی رُو سے ملک کا کسان، مزدور اور غریب بھی اسی طرح سر اُٹھا کر چل سکے جس طرح ملک کا ایک بڑے سے بڑا آدمی چل سکتا ہے۔ جس کی رُو سے ملک کی عدالتیں صرف اسلامی احکام کے مطابق فیصلہ کریں جس کی رُو سے ہر گوشہ میں حق و انصاف کا بول بالا ہو۔ جس کی رُو سے کسی کو کسی پر سیاسی جبر کا موقع حاصل نہ رہے۔ جس کی رُو سے پاکستان کے مسلمان ایک متحدہ قوت بن کر سربلند ہو سکیں۔

جمعیتہ علماء اسلام نے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک طریق کار اختیار

کیا ہے جس کے ذریعے نہ تو اسلام کے نام کو خود غرضانہ مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جا سکے ۔ نہ ملک کے مختلف حلقوں اور گروہوں کے درمیان نام نہاد کفر و اسلام کی کش مکش سر اُٹھا سکے ۔ نہ ملک اور عوام کا اتحاد پارہ پارہ ہو سکے اور نہ ملک کے غریب عوام، کسان، مزدور وغیرہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکیں کہ اُن کے مسائل کا حل اسلام میں موجود نہیں ہے ۔ داخلی امن وامان اور ملکی استحکام کو برقرار رکھتے ہوئے صرف اسلام کی اساس پر ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے ملک کے تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل حل ہو جائیں ۔ جمعیتہ علماء اسلام نے ان تمام پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھ کر ہی اپنا منشور مرتب کیا ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اگر جمعیتہ علماء اسلام کے منشور پر اس کے طریقِ کار کے مطابق عمل کیا جائے ۔ تو انشاء اللہ تعالےٰ ملک میں ایسی سیاسی و اقتصادی تبدیلیاں رونما ہو جائیں گی ۔ جو خالص اسلامی نظام کے نفاذ اور قیام کی اساس ثابت ہوں گی ۔

میں آخر میں یہ عرض بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ جمعیتہ علماء اسلام پاکستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی خواہاں ہے کہ پورا عالمِ اسلام اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو جائے لیکن یہ اتحاد عملاً اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتا ۔ جب تک کہ مسلمانوں کی سرزمین سے غیر ملکوں کے سیاسی اور اقتصادی اثرات کا کلیتہً خاتمہ نہ ہو جائے ۔ عربوں کے سینہ سے اسرائیل کا خنجر نہ اُٹھا دیا جائے اور کشمیر کے مسلمان آزادی کے حق سے بہرہ ور نہ ہو جائیں ۔ چنانچہ میری جماعت اسرائیل اور غیر ملکی سامراج کے اثرات کے خلاف عربوں کی غیر مشروط اور بلا تنقید حمایت کرتی ہے ۔ اہلِ کشمیر کی آزادی کی جدّوجہد تیز تر کرنے میں پوری پوری معاونت کی حامی ہے ۔ میری جماعت بھارت میں بسنے والے چھ کروڑ مسلمانوں کے موجودہ سنگین حالات سے بھی بے پرواہ نہیں ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی اخوّت اور

اسلامی مساوات کی اساس پر مبنی نظام کے قیام سے پاکستان میں ایک ایسی مستحکم اور باا ثر حکومت قائم ہو سکتی ہے جو بھارت کے مسلمانوں کے مصائب کا مداوا کرنے کے قابل ثابت ہو سکے گی۔

ایسی ہی حکومت اہلِ کشمیر کی آزادی اور اسرائیل کی جارحیت کے مقابلہ میں عربوں کی پشت پناہ بھی بن سکتی ہے۔

یہ ہے ہماری جمعیّۃ کا موقف، مسلک، پالیسی اور پروگرام۔

سامعینِ محترم! برّصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں علماء دین کا ہمیشہ سے یہ ہی مقصود رہا ہے۔ کہ اس سرزمین پر اسلام کا صحیح اور مکمّل نظام قائم ہو۔ اس سلسلے میں حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی و عملی خدمات اس جدّوجہد کے سنہری ابواب ہیں اور شہیدانِ بالاکوٹ نے اپنے خون کی قربانی دے کر ان ابواب کو مداومت بخشی ہے۔

پاک و ہند کے علماء ان قدسی صفات بزرگوں اور پیشروؤں کے نقشِ قدم پر ہی اسلام کا قافلہ لے کر رواں دواں رہے ہیں۔ برطانوی استبداد سے ایک صدی سے زیادہ تک ان کا مقابلہ عہدِ حاضر کی تاریخ کے مسلّمات میں سے ہے۔ میری جماعت کل پاکستان جمعیّۃ علماء اسلام علماء حق کے اس سلسلہ کے مشن کی امین اور پیروکار ہے اور سمجھتی ہے کہ جس دن بھی پاکستان میں قرآن و سنّت کا حقیقی نظام قائم ہو گا وہ دن برّصغیر پاک و ہند میں داخل ہونے والے پہلے مجاہد کی روح سے لے کر حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ شہدائے بالاکوٹ، شہدائے تحریکِ آزادی کی روحوں کے مسرّت و اطمینان کا دن ہو گا اور عالمِ بالا میں اُن کی دعائیں اہلِ پاکستان کا ساتھ دے رہی ہوں گی میری جماعت ماضی کی تاریخ کے اس تیرہ سو سالہ مشن کی تکمیل میں ہی مصروف ہے اور

انشاءاللہ یہ بین ولبیار کی پرواہ کیے بغیر اپنا یہ مشن جاری رکھے گی۔ اسے اللہ کی مدد سے پاکستان کے مسلمانوں کی اعانت کی پوری پوری توقع ہے۔[1]

---

[1] "اذانِ سحر" ص ۹۲ تا ۹۹ از شمس القمر قاسمی۔

قادیانی اِسلام اور ہندوستان دونوں کے غدّار ہیں:

اقبالؒ بنام جواہر لال نہرو
۲۱ رجون ۱۹۳۶ء

فِتنۂ قادیانیت کے خطّ و خال واضح کرنے اور اس کے مضرات کی نشاندہی میں اگرچہ امام العصر علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، چودھری افضل حقؒ اور سید ابو الحسن علی ندوی ایسے اکابر و مشاہیر نے بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مگر قادیانیت کو نقد و نظر کے ترازو میں جس طرح شاعرِ مشرق، حکیم الامت اور مصورِ پاکستان اقبالؒ نے تولا، واقعہ یہ ہے کہ وہ انہی کا حق تھا۔ اسی اجمال کی تفصیل کا نام ہے 'اِقبالؒ اور قادیانی'، جس کی تالیف پر پاکستان و ہند کے نامور علماء و فضلاء اور اخبارات و جرائد نے نعیم آسی کو بے پایاں خراجِ تحسین پیش کیا۔

اقبال
اور
قادیانی
نعیم آسی

○ چونکا دینے والے حقائق
○ حیرت انگیز واقعات
○ تاریخی دستاویزات

دیدہ زیب سرِ ورق
خوبصورت کتابت و طباعت
صفحات ۱۸۸ قیمت ۱۲ روپے

خوبصورت کتابیں چھاپنے والا ادارہ

مُسلم اکادمی، وزیر پورہ، سیالکوٹ

[ام جمہوریا]